إِنْ أُرِيْدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

جنوری ۲۰۱۲ء

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ البرہان

جلد۱۶، شمارہ ۱ جنوری ۲۰۱۲ء/ صفر ۱۴۳۳ھ

مشمولات

خوش فہمیاں		۲
تعلیم و تربیت		
دینی مدارس کے لیے نئے نصاب کا خاکہ (۲)	مولانا حسین احمد مدنی	۳
اسلام اور مغرب		
مغربی فکر کے ساتھ مفاہمتی پالیسی کی ناکامی اور نئی اجتہادی اپروچ کی ضرورت	مدیر	۷
مغربی جمہوریت کو اسلامی جمہوریت بنانے کا تجربہ اور اس کے نتائج	ڈاکٹر محمد امین	۱۲
تزکیۂ نفس		
تہجد کی عادت کیسے ڈالیں؟	احمد جاوید	۳۳
پاکستانیات		
پاکستان میں نفاذ شریعت کی متبادل حکمت عملی سید مودودیؒ کے حلقۂ فکر کی خدمت میں چند گزارشات	مدیر	۳۷
ملی مجلس شرعی		
توہین رسالت کے بارے میں تمام مکاتب فکر کا متفقہ فتویٰ	ادارہ	۴۶
بزم قارئین		
البرہان پر قارئین کے کھٹے میٹھے تبصرے	ادارہ	۵۱

البرہان آن لائن دستیاب ہے
http://www.safa.edu.pk/category/al-burhan/

خوش فہمیاں

} فرمایا مولانا فضل الرحمن صاحب نے کہ اگر ملک میں غیر جانبدارانہ انتخابات ہوں تو ہم سارے ملک سے جیت جائیں گے۔

} پچھلے دنوں جماعت اسلامی نے لاہور میں دھرنا دیا تو کئی بینرز پر ہم نے یہ نعرہ لکھا دیکھا کہ 'ترکی، مصر اور تیونس کے بعد اب پاکستان میں اسلامی عوامی انقلاب'۔

} دیکھیے! کام کے نتائج کے حوالے سے انسانی ردعمل تین طرح کا ہوسکتا ہے۔ ناامیدی، خوش فہمی اور پُرامیدی۔ ناامیدی مہلک ہے کہ اس سے مایوسی پھیلتی ہے جو قوائے عمل کو شل کر دیتی ہے۔ خوش فہمی نقصان دہ ہے کیونکہ اس سے آدمی اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کا غلط اندازہ لگاتا ہے اور یوں اپنے آپ کو دھوکہ دیتا ہے۔ ہمارے ایک رفیق کار کہا کرتے تھے Cheat every one in the world but don't cheat yourself یعنی بھلے تم سب کو دھوکہ دو لیکن اپنے آپ کو دھوکہ کبھی نہ دینا۔ کیونکہ خوش فہمی اور خود فریبی کا لازمی نتیجہ ناکامی ہوتا ہے اور مسلسل ناکامی بہرحال مضر ہوتی ہے کہ منزل کی دوری کسی نہ کسی نوع کی مایوسی کو ضرور جنم دیتی ہے۔ اپنی پوزیشن کا اگر معروضی اور متوازن انداز میں تجزیہ کرتے ہوئے صحیح اندازہ لگایا جائے اور صحیح سمت میں محنت کی جائے اور اس کے بعد پُرامید رہا جائے تو یہ صحیح رویہ ہے اور اس سے کامیابی کا راستہ کھلتا ہے۔

} ہمیں چونکہ اپنے ملک کی دینی قوتوں سے محبت ہے، ہم ان کے حمایتی ہیں اور ان کی کامیابی کے متمنی ہیں اور چاہتے ہیں کہ ملک میں حقیقی اور مؤثر تبدیلی آئے اور اسلامی تناظر میں آئے اس لیے ہم نہیں چاہتے کہ وہ خوش فہمی میں مبتلا ہو کر ایک بار پھر ناکامی کا منہ دیکھیں۔ اس لیے الحذر —— ثم الحذر—— کہ ہمیں اپنے معاشرے میں آپ کی مقبولیت اور وسیع تر حمایت کہیں نظر نہیں آتی۔

مولانا سید حسین احمد مدنی

دینی مدارس کے لیے نئے نصاب کے
اصول وقوانین کلیہ

۱۔ چونکہ یہ نصاب صوبہ بنگال اور آسام کے مسلمانوں کے لیے ہے اس لیے اس میں بنگلہ زبان میں تحریری اور تقریری ترقی کو خاص اہمیت دی گئی ہے دوسرے صوبوں والے بجائے بنگلہ کے اپنے صوبہ کی اس زبان کو جو سوائے اردو کے اپنی استقلالی شان رکھتی ہو قائم کریں۔

۲۔ نصاب میں علوم دینیہ اور فنون عربیہ کو نہایت زیادہ قابل توجہ قرار دیا گیا ہے اور حتی الوسع عربی قدیم کی تعلیم اور اس کی مفید کتابوں اور فنون کو اسی طرح محفوظ رکھا گیا ہے جس طرح پہلے سے چلی آتی ہے اس لیے یہ کوئی نئی اسکیم نہیں ہے بلکہ وہی پرانی اسکیم ہے —— ہاں پرانی اسکیم میں جن فنون اور جن کتابوں کی کمی تھی اور زمانۂ موجودہ میں ان کی اشد ضرورت محسوس ہوئی ان کو بھی نہایت تھوڑے تغیر سے داخل نصاب کر دیا گیا ہے۔

۳۔ اس نصاب کے تین حصے کر دیے گیے ہیں جن کے لیے مجموعی حیثیت سے سولہ برس کی مدت ضروری خیال کی گئی ہے اوّل مکتب (مدرسۂ ابتدائیہ) دوم مدرسہ ثانویہ (جونیئر) اورسوم مدرسہ عالیہ (سینئر)

۴۔ مکتب (حصہ ابتدائیہ) کی تعلیم تین سال قرار دی گئی ہے اس میں وہ فنون اور کتب واعمال رکھے گئے ہیں جو کہ ہر مسلمان کے لیے بحیثیت مذہب وانسانیت نہایت ضروری ہیں۔

۵۔ مدرسۂ ثانویہ (جونیئر) اس کی مدت تعلیم ۵ سال قرار دی گئی ہے۔ اس درجہ میں ان علوم وفنون والسنہ وکتب وغیرہ کو تجویز کیا گیا ہے جو کہ مذہبی دنیاوی زندگی کی ضروری آسانیاں پیدا کرنے والے ہیں۔

۶۔ درجہ عالیہ (سینئر) اس کی مدت تعلیم آٹھ سال رکھی گئی ہے۔ اس کا عنصر غالب فنون عربیہ اور علوم دینیہ کا اہم اور مفید ذخیرہ ہے۔ رائج الوقت نظام تعلیم ہر جگہ اس ذخیرہ میں ناقص ہے۔ کوشش بلیغ کی

گئی ہے کہ ہر قسم کی کمی کو حتی الوسع زائل کیا جائے۔
۷۔ موجودہ نظام تعلیم جو کہ تمام بنگال و آسام میں رائج ہے علم حدیث وتفسیر کو ضروری اور تعلیم اسلامی کا عضو رئیس نہیں سمجھتا ورنہ اس فن کو تکمیل (ٹائٹل) میں داخل نہ کرتا حالانکہ یہ علوم نہایت ضروری اور اہم بلکہ مقاصد ذاتیہ میں سے ہیں۔ دوسرے فنون فقط آلات اور خدمت گزار ہیں۔ درس نظامی میں بھی بہت سے علوم کو ضرورت وقت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے جو کہ ضیاع عمر کا باعث اور خسارہ دین و دنیا کا سبب ہے اور بہت سے ضروری فنون و کتب سے چشم پوشی بھی گوارا کرنے کی بدنمائی اس میں موجود ہے اس لیے حدیث اور تفسیر وغیرہ کو اسی درجہ میں داخل کیا گیا ہے۔
۸۔ اس نصاب کا ہر درجہ تقریباً مستقل اور اپنی اپنی اغراض میں دوسرے حصوں سے مستغنی ہے اس لیے مکتب (درجہ ابتدائیہ) سے فارغ ہوکر بچے اگر تعلیم سے علیحدہ ہوجائیں یا سکولوں اور کالجوں میں داخل ہوجائیں تو ان کو مکتب کے مقاصد میں کوئی نقصان سدراہ نہ ہوگا اور علی ہذا القیاس درجہ ثانویہ اور عالیہ ہر ایک مستقل طور پر فیض رساں ہیں۔
۹۔ اس نصاب میں پانچ زبانوں کی تعلیم کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ بنگلہ (صوبہ کی زبان) اردو، فارسی، انگریزی، عربی مگر اوّل الذکر (بنگلہ) کو بوجہ صوبہ کی زبان ہونے کے اور آخر الذکر (عربی) کو بوجہ مذہبی اور علمی زبان ہونے کے زیادہ تر اہمیت دی گئی ہے۔ باقی ماندہ السنہ ثلاثہ (اردو، فارسی اور انگریزی) کو بقدر ضرورت لازم کیا گیا ہے۔ البتہ اردو زبان چونکہ ہندوستان میں مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے اور علمی زبان ہونے کا فخر بھی حاصل کرچکی ہے اس لیے اس کا مرتبہ بہ نسبت باقی ماندہ ہر دو زبانوں (فارسی و انگریزی) کے اعلیٰ رکھا گیا ہے۔ پھر انگریزی چونکہ حکومت کی زبان ہے اور بہت سے وہ دنیاوی کاروبار جن سے کوئی شخص تازیست مستغنی نہیں ہوسکتا اس سے متعلق ہیں اس لیے اس کو فارسی زبان پر فوقیت دی گئی ہے۔
۱۰۔ اس نصاب میں قرآن شریف سے قوی تعلق پیدا کرنے کی زیادہ تر کوشش کی گئی ہے تاکہ طلباء کا کوئی زمانہ قرآن شریف سے اجنبیت نہ رکھے اور یہ امر نہایت قوی ذریعہ ان کو معانی قرآن اور تفسیر کے سمجھنے اور اس کے رنگ سے قلوب کو رنگین کرنے کے لیے ہوسکے۔ افسوس ہے کہ رائج الوقت نصاب میں اس کی طرف سے بہت زیادہ ہی بے توجہی برتی گئی جس کا بدنما نتیجہ مخفی نہیں ہے۔

۱۱۔ اس نصاب میں علم تاریخ، ادب عربی، علم حدیث کو بھی نسبت دیگر فنون کے زیادہ اہمیت دی گئی ہے جس کی وجہ ارباب بصیرت پر مخفی نہیں۔

۱۲۔ طلباء کو واقعات زمانہ اور اخبار پر مطلع ہونا، اخبار بینی سے دلچسپی پیدا کرنا، مضامین لکھنے اور ان کی اشاعت وغیرہ کی مہارت حاصل کرنا، ابنائے زمانہ کی آراء اور ان کی ذہنیتوں کا احاطہ کرنا وغیرہ وغیرہ چونکہ نہایت ضروری امور ہیں اس لیے ہر مدرسہ میں دارالمطالعہ ہونا ضروری ہے۔جس میں ہر قسم کے اخبار اور ماہواری رسائل وغیرہ موجود رہا کریں اور وقت معین پر طلباء جا کر چپ چاپ بیٹھ کر ان کا مطالعہ کریں۔

۱۳۔ دارالمطالعہ کے لیے روزانہ ہر طالب علم (درجہ عالیہ و سافلہ کا) آدھ گھنٹہ صرف کیا کرے جس میں سے پاؤ گھنٹہ اوقات نظام سے ہوگا اور پاؤ گھنٹہ اوقات تعطیل نماز میں سے۔

۱۴۔ دارالمطالعہ میں ہنسی مذاق، شور وشغب، گفتگو وغیرہ سب ممنوع ہوں گے۔

۱۵۔ درجہ ثانویہ اور عالیہ کے طلباء کے لیے لازم ہوگا کہ مذکورہ ذیل دستکاریوں میں سے ایک یا چند دستکاری سیکھیں جس کے تعین میں ان کو اختیار ہوگا:

چرخہ چلانا اور کپڑا بننا، حدادی (لوہے کا کام)، نجاری (بڑھئی کا کام)، خیاطت (کپڑا سینا)، گھڑی سازی، جلد بندی، چمڑا رنگنا، بوٹ وغیرہ بنانا اور صیاضت (سونار کا کام) وغیرہ وغیرہ۔

۱۶۔ اس نصاب میں انگریزی زبان کو صرف اس درجہ تک ملحوظ رکھا گیا ہے جس سے ضروری کاروبار انجام پاسکیں۔

۱۷۔ اس نصاب میں فنون کو حتی الوسع ملکی زبان میں تعلیم دینے کی کوشش کی گئی ہے البتہ عربی علوم و فنون کو مختلف مصالح کی بناء پر عربی زبان میں ہی تعلیم دینا ضروری خیال کیا گیا ہے۔

۱۸۔ عربی زبان کے سوا اور دوسری زبانیں محض بحیثیت زبان تعلیم دی جائیں گی۔

۱۹۔ عالیہ اور سافلہ میں کچھ ایسی آسان کتابیں رکھی گئی ہیں جو کہ درسیات میں شمار نہ ہوں گی مگر طلباء ان کو مطالعہ کر کے مضامین کے یاد کرنے کے مکلف ہوں گے اور امتحان میں ان کا پورا لحاظ رکھا جائے گا۔ایسی کتابوں کو خانہ درسیات کے آخر میں بین القوسین ذکر کیا گیا ہے۔

۲۰۔ عالیہ اور سافلہ کے درجات میں حسب حیثیت مذکورہ نصاب تحریر اور تقریر کی مشق کرنی لازم ہوگی۔

۲۱۔ ہر زبان کی تعلیم کے ساتھ اس کے املاء اور کتابت کا درست کرنا ضروری ہوگا اور ہر زبان کی خوش نویسی کا امتحان مستقل اور علیحدہ ہوگا۔

۲۲۔ روزانہ عالیہ اور سافلہ کے طلباء کو ضروری ہوگا کہ وہ ان جسمانی فنون و اعمال کی عصر کے بعد مشق کیا کریں جن سے صحت جسمانی پر نہایت مفید اثر پڑے اور فن سپہ گری بھی ہاتھ آئے جیسے پٹہ، گدکا ہلکڑی، بنوٹ اور تلوار وغیرہ۔

۲۳۔ طلباء کی حاضری اور ان کے اخلاق کا خاص طور سے لحاظ رکھا جائے گا اور ہر دو امر کے متعلق مدرسین اور منتظمین کی شہادت پر ان کو خاص نمبر اور انعام سالانہ دیا جائے گا۔

۲۴۔ اس نصاب کے بعد تکمیل کے درجات ہوں گے جن میں مختلف شعبوں اور زبانوں کی تکمیل کا لحاظ کیا جائے گا مثلاً شعبہ تبلیغ، شعبہ تعلیم (ٹریننگ) وغیرہ۔ انہی درجات تکمیل میں فتاوی، ادبیات عربیہ، ادبیات بنگلہ، ادبیات اردو، ادبیات فارسی، ادبیات انگریزی، الجبرا ہندسہ و ریاضی (جیومیٹری)، علم طب، علم قرأۃ، فلسفہ قدیم و جدید، منطق اور تفسیر وغیرہ کی تکمیل کا لحاظ کیا جائے گا مگر ان کی تفصیل اس نصاب میں بالفعل نہیں دی گئی۔ آئندہ اس کے جاری اور منظم ہوجانے پر اس کی بھی اسکیم تیار کی جائے گی۔

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنائیے۔

زرِاعانت سالانہ 400 روپے تاحیات 5000 روپے خصوصی تعاون 10,000 روپے

نام.................................... پتہ....................................

فون نمبر....................................

چیک اور منی آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ A-71 فیصل ٹاؤن، لاہور بھجوائیے

ٹرسٹ کو دیے جانے والے عطیات ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں

۲۵۔ ہر تین برس میں اس نصاب پر غور کرنا ہوگا۔ اور حسب ضرورت و اقتضائے وقت و تجربہ ضروری اصلاحات اور ترمیمات عمل میں لانا ہوں گی۔

۲۶۔ اس نصاب میں اندازہ کیا گیا ہے کہ سال بھر میں تقریباً ساڑھے سات مہینے تعلیم میں خرچ ہوں گے یعنی سالانہ تعطیل اور ہفتہ وار تعطیل اور ایام امتحان کو منہا کر دینے کے بعد جو زمانہ بچتا ہے وہ تعلیم کا خاص زمانہ ہے۔

۲۷۔ اس نصاب میں جو کتابیں غیر معروف ہیں اور ہر جگہ دستیاب نہیں ہوتیں ان کا پتہ لکھ دیا گیا ہے تاکہ ان کے منگوانے میں دقت نہ ہو۔

اسلام اور مغرب

ڈاکٹر محمد امین

مغربی فکر و تہذیب کے ساتھ مفاہمتی پالیسی کی ناکامی

اور نئی اجتہادی اپروچ کی ضرورت

ہر عہد کا ایک فتنہ اور ہر عصر کا ایک چیلنج ہوتا ہے اور ہمارے عہد کا فتنہ اور ہمارے عصر کا چیلنج —— اسلام اور مسلم تناظر میں سوچتے ہوئے —— مغربی فکر و تہذیب ہے۔ ہم چاہیں یا نہ چاہیں، شعوری یا لاشعوری طور پر، ہماری ہر سوچ، ہمارا ہر عمل —— خواہ وہ دینی ہو یا دنیاوی —— اس فکر و تہذیب سے متاثر ہے یا اس کے ردعمل پر مبنی ہے کیونکہ یہ فکر و تہذیب اس وقت دنیا پر غالب ہے اور جس دنیا پر وہ غالب ہے اس میں عالم اسلام اور مسلمان معاشرے بھی شامل ہیں۔ ممکن ہے یہ بات ہمیں چبھے اور اچھی نہ لگے لیکن یہ ایک حقیقت ہے —— گو تلخ سہی —— کہ ہماری تہذیب اس کے ہاتھوں شکست کھا چکی ہے۔ ہم پچھلی دو تین صدی ان کے غلام رہ چکے ہیں اور اب بھی، بظاہر آزادی کے باوجود، سیاسی، عسکری، معاشی، تعلیمی، قانونی اور معاشرتی شعبوں میں بڑی حد تک اس فکر و تہذیب اور اس کے علمبرداروں کے غلام ہی ہیں۔ جو کوئی ان حقائق کا انکار کرے وہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی دن کی روشنی میں کہے کہ آج سورج طلوع نہیں ہوا۔ ظاہر ہے اس میں قصور اس کی بصارت و بصیرت کا ہے نہ کہ سورج کی روشنی کا۔

اس اظہار حقیقت سے، خدانخواستہ، مغرب کی حمایت اور ہیبت و عظمت دلوں پر بٹھانا مقصود نہیں بلکہ صرف حقیقت حال کی نشان دہی مقصود ہے تاکہ ہمیں خوب اندازہ ہوجائے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں اور

اگر ہمیں اپنی بقاء اور استحکام کے لیے جدوجہد کرنا ہے تو ہمیں اپنی موجودہ پوزیشن کا اچھی طرح ادراک ہوجائے تا کہ ہم اہل مغرب اور مغربی تہذیب کے حوالے سے مناسب اور مؤثر حکمت عملی وضع کر سکیں۔

مغربی تہذیب سے ہم نے جو شکست کھائی اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ اصول جن پر ہماری تہذیب کھڑی تھی خدانخواستہ غلط، ناکارہ اور ازکار رفتہ ثابت ہوگئے تھے بلکہ یہ تھی کہ ہم نے ان سنہری اصولوں پر عمل کرنا چھوڑ دیا تھا اور اپنی غفلت، کوتاہی اور نالائقی سے ہم نے انسان سازی کا وہ عمل ترک کر دیا جو صحیح اسلامی معاشرے کی تشکیل، بقاء اور استحکام کے لیے ناگزیر تھا ورنہ ہم دنیا کی وہ واحد تہذیب ہیں جن کے نہ صرف بنیادی مآخذ (قرآن وسنت) اس کے پاس محفوظ ہیں بلکہ ان پر عمل کی روایت (اجماع اور تعامل امت) بھی اس کے پاس محفوظ ہے کیونکہ مسلم معاشرہ بلا انقطاع پچھلے چودہ سو سال سے اس دھرتی کے سینے پر قائم چلا آرہا ہے اور اس میں کوئی تعطل نہیں آیا اور پچھلی دو تین صدیوں کے زوال اور غلامی نے بھی ہمیں ان قیمتی اثاثوں سے محروم نہیں کیا اور تہذیبی زوال کے باوجود ہم فکری ثروت وعظمت سے محروم نہیں ہوئے اور انہی کے بل پر ہم کہتے ہیں کہ ہم اپنی عظمت گم گشتہ کو لوٹا سکتے ہیں اور مسلم امہ اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کر سکتی ہے۔

بہر کیف مسلمانوں نے اہل مغرب کے غلبے کے خلاف مزاحمت کی اور ڈیڑھ دو صدی کے اندر ہی اس کے شکنجے کو توڑنے میں کامیاب ہوگئے تاہم مغرب کا استیلا ہمہ پہلو اور ہمہ گیر تھا اور وہ ابھی تک جاری ہے اور اسی طرح مسلمانوں کی طرف سے اس کی مزاحمت بھی جاری ہے۔ ہاں! یہ ضرور ہوا ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد مغرب نے اپنے غلبے اور استحصال کو جاری رکھنے کے لیے پُر امن ذرائع کا چولا بدل لیا تھا لیکن پچھلے دس پندرہ سالوں سے اسے وہ نقاب بھی اتارنا پڑا اور اس نے دوبارہ عالم اسلام کے خلاف جنگ چھیڑ دی ہے جس میں اسے اس دفعہ یہود و ہنود کی حمایت بھی حاصل ہے اور مسلم امت اس کی مزاحمت بھی کر رہی ہے۔ بہر حال مغربی تہذیب اور اس کے غلبے کے خلاف مسلمانوں کے رد عمل کی مندرجہ ذیل صورتیں ہمارے سامنے آتی ہیں:

۱۔ مغربی فکر وتہذیب سے مرعوب و متاثر ہوکر اس کی پیروی کی دعوت دینا اور اسلامی فکر ونظر کو اس کے مطابق ڈھالنے کی سعی کرنا۔ تجدد کے اس رجحان کے پاکستان میں نمائندے غلام احمد پرویز اور جاوید احمد غامدی وغیرہ ہیں۔

۲۔ مغربی فکر وتہذیب کی مخالفت اور اصل اسلامی اداروں کی بحالی کی کوشش جیسے خلافت کی بحالی کی تحریک چلانا اور مغرب زدہ سیاسی نظام میں شریک نہ ہونا۔ یہ رویہ حزب التحریر اور تنظیم اسلامی وغیرہ کا

ہے۔
۳۔ مغربی فکر و تہذیب سے مفاہمت کا رویہ اور اس کے قائم کردہ اداروں میں تھوڑی بہت اسلامی اصولوں کی آمیزش کر کے انہیں قبول کر لینا۔ ہمارے ہاں سیاست میں اس مفاہمتی روش کی نمائندگی جماعت اسلامی، جمعیت علماء اسلام، جمعیت اہل حدیث اور جمعیت علماء پاکستان وغیرہ کرتی ہیں اور معیشت میں اسلامی بنکنگ کے حوالے سے مولانا تقی عثمانی صاحب اور پروفیسر خورشید احمد وغیرہ۔
۴۔ مغربی فکر و تہذیب سے صرف نظر کا رویہ جیسے تبلیغی جماعت اور دینی مدارس کا ہے۔
۵۔ مسلح مزاحمت۔ چونکہ مسلم ممالک میں اقتدار اکثر ایسے حکمرانوں کے پاس ہے جو مغرب سے مرعوب و متاثر بلکہ ان کے حمایتی اور ایجنٹ ہیں اس لیے بعض مسلمانوں نے مغرب کے حملوں کا مقابلہ کرنے کے لیے گوریلا تنظیمیں بنالی ہیں جیسے طالبان اور القاعدہ وغیرہ۔

اگرچہ مندرجہ بالا رجحانات کے بارے میں ہم پہلے بھی لکھتے رہتے ہیں تاہم اس سلسلے میں ہماری تازہ کاوشوں میں سے ایک کوشش وہ تھی جس میں ہم نے البرہان (اکتوبر ۲۰۱۱ء) میں جاوید احمد غامدی صاحب کے متجددانہ رویے اور مولانا زاہدالراشدی صاحب کی ان کی حمایت کے بارے میں لکھا اور اس دفعہ ہم مغربی فکر کے ساتھ مفاہمتی رویے اور اس کے نتائج کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ اِس مفاہمتی رویے کے اثرات اگرچہ سارے شعبہ ہائے زندگی میں نمایاں نظر آتے ہیں تاہم تین شعبے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں یعنی سیاست، معیشت اور تعلیم۔ سیاست میں مفاہمتی رویہ یہ ہے کہ مغرب کی اسلام اور مسلم دشمنی کے باوجود اور اس حقیقت سے صَرفِ نظر کرتے ہوئے کہ مغربی تہذیب اور اس کے سارے ادارے (بشمول سیاست[جمہوریت] ومعیشت[بنکنگ]اور تعلیم) مغرب کی لادین فکر (ہیومنزم، سیکولرزم، لبرلزم، ایمپریسزم وغیرہ) پر مبنی ہیں، ان میں کچھ اسلامی اصول داخل کر کے انہیں قابل قبول سمجھ لینا اور ان میں حصہ لینا جیسا کہ پاکستان کی مذکورہ بالا دینی سیاسی جماعتیں یہاں کے سیاسی اور انتخابی نظام میں فعال شرکت کر رہی ہیں۔ اور اسی طرح معیشت میں مغرب کے سرمایہ دارانہ معاشی نظام کے ایک ذیلی اور فرعی ادارے 'بنکنگ' میں چند اسلامی اصول داخل کر کے اسے 'اسلامی بنکنگ' قرار دے لینا اور پاکستان میں اسلامی نظام تعلیم کے علمبرداروں کا مغرب کے اسلام مخالف ورلڈ ویو اور تصور علم پر مبنی تعلیمی نظام کی پیروی شروع کر دینا شامل ہیں۔

تجدد پر مبنی فکر کو ہم نے انحراف اور گمراہی قرار دیا تھا کیونکہ وہ شاذ تھی اور ملحدانہ و اسلام مخالف مغربی فکر و تہذیب کو مسلمانوں کے لیے قابل قبول بنانے اور اسلام کو اس کے مطابق ڈھالنے کی روش

پر قائم تھی لیکن مفاہمتی روش تو ہمارے ہاں جمہور کی روش ہے کیونکہ اس میں ہماری ساری روایتی دینی قیادت (دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور شیعہ علماء) اور جدید دینی تحریک (جماعت اسلامی) شامل تھی جیسا کہ علماء کے متفقہ ۲۲ نکات اور سارے مکاتب فکر کا سیاسی جماعتیں بنا کر عملی سیاست میں حصہ لینے سے ظاہر ہے لہٰذا ہم اس کے بارے میں یہ کہنا چاہیں گے کہ علماء کرام نے مل کر ایک اجتہادی فیصلہ کیا لیکن وہ عملاً مفید ثابت نہیں ہوا اور اس کے نتیجے میں ہمارے ملک میں اسلام تو آیا نہیں (اور نہ شریعت نافذ ہوئی ہے ـــــ اور نہ مستقبل میں اس کا بظاہر کوئی امکان نظر آتا ہے) البتہ مغربی فکر وتہذیب اور اس کی اقدار ہمارے معاشرے میں سکہ رائج الوقت بن چکی ہیں۔ لہٰذا ہماری رائے ہے کہ اس اجتہادی فیصلے پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

یہاں یہ سمجھنے کی بھی ضرورت ہے کہ جمہور علماء کرام نے یہ فیصلہ کیوں کیا تھا؟ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ علماء کرام نے یہ فیصلہ بظاہر اس حکمت کے پیش نظر کیا تھا کہ اگر ہم نے اس نوزائیدہ ملک میں سیاست میں حصہ نہ لیا اور ماضی کی طرح مساجد اور مدارس میں بیٹھے رہے اور خلافت کا ادارہ ختم ہو چکا ہے تو حکمران اس ریاست اور معاشرے کو بے دینی کی راہ پر بگٹٹ دوڑاتے لے جائیں گے اور کوئی ان کے ہاتھ نہیں روک سکے گا کیونکہ معاشرہ ایک متحرک زندہ جسم کی طرح ہوتا ہے اور اس کی حرکت کو بریکیں لگا کر روکا نہیں جاسکتا۔ یوں یہ ایک طرح کی مجبوری اور تاریخ کا جبر تھا کہ انہیں یہ فیصلہ کرنا پڑا ورنہ اگر جمعیت علماء اسلام، جماعت اسلامی اور جمعیت العلماء و پاکستان بھی تنظیم اسلامی یا تبلیغی جماعت کی طرح سیاست کے میدان سے باہر کھڑے ہوتے تو آج تصور کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے سیاسی حکمران کس طرح اس ملک کو کفر اور فسق کا گڑھ بنا چکے ہوتے۔ ہم جس نظر ثانی کی اپیل علماء سے کر رہے ہیں اس کے نتیجے میں وہ اپنے پہلے فیصلے کو کالعدم بھی قرار دے سکتے ہیں لیکن اس کا عملی امکان چونکہ ہمیں کم نظر آتا ہے اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا اگر ازالہ نہیں ہوسکتا تو اصلاح اور امالہ تو ہو ہی سکتا ہے جس کے لیے چار اقدامات ناگزیر ہیں:

۱۔ اسلامی اصول واقدار کی حمایت کرنے کے ساتھ ساتھ ملحدانہ مغربی فکر وتہذیب کی مخالفت کی جائے اور اس کے لیے تعلیم وتربیت، الیکٹرانک و پرنٹ میڈیا، منبر ومحراب اور دیگر سارے پُرامن ذرائع استعمال کیے جائیں۔

۲۔ مغرب کی ملحدانہ فکر وتہذیب اور اس کے سیاسی و معاشی اداروں میں معمولی اسلامی کتر بیونت کے بعد انہیں اسلامی قرار دینے کی مفاہمتی پالیسی اپنانے کی بجائے فکری استقلال، حریت اور اصالت سے

کام لیتے ہوئے اسلام کی حیات آفرین تعلیمات کی روشنی میں اسلام کے سیاسی، معاشی اور تعلیمی نظام کی تشکیل و تدوین نو کا علمی کام کیا جائے تاکہ مغرب زدہ مسلمانوں اور دنیا کو اسلام اور مسلمانوں کی فکری عظمت کا احساس ہو اور وہ اسے اپنانے کی طرف آئیں۔

۳۔ مسلم فرد اور معاشرہ کی اصلاح (فکری تطہیر سے لے کر اخلاقی اصلاح کے عملی اقدامات تک) کے لیے مندرجہ بالا پہلے اصول (یعنی اسلامی اصولوں پر عمل اور مغربی اقدار کا رد) کی روشنی میں متحد و منظم ہو کر سارے پُرامن ذرائع استعمال کیے جائیں اور اس کے لیے اقتدار کا انتظار نہ کیا جائے۔

۴۔ غلط اور فاسد نظام نے مسلمان عوام کی تکلیفوں، پریشانیوں اور دکھوں میں بے انتہا اضافہ کر دیا ہے۔ اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے کہ مصائب میں ان کا ہاتھ بٹایا جائے اور ان کی تکلیفوں کو کم کرنے کے لیے خدمت خلق کو اپنا شعار بنایا جائے۔

توقع ہے کہ ان اقدامات سے معاملہ متوازن ہو جائے گا اور معاشرہ سیدھے راستے پر آ جائے گا اور اسلامی مقاصد پورے ہونے لگیں گے۔

یہ مؤقف جو ہم نے سطور بالا میں اجمالاً پیش کیا ہے کہ سیاست، معیشت اور تعلیم اور دوسرے شعبہ ہائے زندگی میں مغربی فکر و تہذیب سے مفاہمت کی روش سے ہمارے ہاں اسلامی اقدار مغلوب ہوئی ہیں اور مغربی اقدار ہمارے معاشرے میں غالب آ گئی ہیں، اسے ثابت کرنے کے لیے ہم البرہان میں ایک سلسلہ ٔمضامین شروع کر رہے ہیں اور اس سلسلے کا پہلا مضمون 'مغربی جمہوریت کو اسلامی جمہوریت بنانے کا تجربہ اور اس کے نتائج' موجودہ شمارے میں شائع کیا جا رہا ہے۔

ان مضامین کا خلاصہ یہ ہے کہ مغربی جمہوریت، مغرب کے نظام سرمایہ داری کی بنکنگ اور مغربی تعلیم اصلاً غیر اسلامی ہیں لہٰذا وہ معمولی اسلامی کنٹربیونٹ سے 'اسلامی' نہیں ہو جاتیں اور نہ اسلامی مقاصد کی برآری میں مفید اور مؤثر ثابت ہو سکتی ہیں اور عملاً نہیں ہوئیں اور نہ صرف پاکستانی سیاست و معیشت و تعلیم آج عدم استحکام کا شکار ہے بلکہ پاکستانی معاشرہ بھی اسلام کی بجائے مغربی تہذیب اور

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ

البرہان کے ناظم عمومی جناب سراج محمود ناصر صاحب کی والدہ ماجدہ 16 جنوری 2012ء کو قضائے الٰہی سے وفات پا گئیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس عطا فرمائیں اور لواحقین کو صبرِ جمیل۔ ادارہ

اس کی اقدار اپنانے کی راہ پر گامزن ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام کے سیاسی، معاشی اور تعلیمی نظام کے احیاء اور تشکیل و تدوین نو کے لیے اجتہادی کوششیں بروئے کار لائی جائیں اور دنیا کے سامنے اسلام کے سیاسی، معاشی اور تعلیمی نظام کا قابل عمل ہونا ثابت کیا جائے کیونکہ کمیونزم کی موت کے بعد اب اہل مغرب خود سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں لہٰذا ہمیں ان کے نظام میں کچھ پیوند کاری اور درخ اندوزی (Patch work) کر کے اسے گزارے لائق بنانے کی بجائے خود اسلام کا حیات آفریں پیغام لے کر اٹھ کھڑا ہونا چاہیے اور یہ ثابت کرنا چاہیے کہ یہ آج کے مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔ اور پھر اس پیغام پر خود بھی عمل کرنا چاہیے اور اسے دنیا کے سامنے بھی پیش کرنا چاہیے۔ یہ ہے وہ بہت بڑا چیلنج جو آج کے مسلم ماہرین معیشت، ماہرین سیاسیات اور ماہرین تعلیم کو درپیش ہے۔ اس کے لیے بنیادی ضرورت فکری استقلال کی ہے تاکہ ہم تخلیقی تحقیق، فکری اصالت (Originality) اور اجتہاد سے کام لیں نہ کہ مفاہمتی پالیسی اپنا کر مغرب کے الحادی نظام میں تھوڑی بہت تبدیلی کر کے اسے عین اسلامی قرار دے لیں۔ بلاشبہ اس کے عملی نفاذ کے لیے ریاستی قوت اور اقتدار کی ضرورت ہے لیکن جہاں تک علمی کام کا تعلق ہے تو مسلم دانشور اور علماء کرام حکومتی مدد کے بغیر آج بھی یہ کام کر سکتے ہیں اور انہیں ضرور کرنا چاہیے۔

اسلام اور مغرب　　ڈاکٹر محمد امین

مغربی جمہوریت کو اسلامی جمہوریت بنانے کا تجربہ اور اس کے نتائج

پاکستان میں اسلام اور جمہوریت کی بحث ایک علمی موضوع تو ہمیشہ سے رہی ہے لیکن آج کل دو وجوہ کی بناء پر اس نے ایک خصوصی اہمیت اختیار کر لی ہے:

ایک تو پاکستان کے شمال مغربی سرحدی قبائلی علاقوں میں ایک دینی عنصر ایسا پیدا ہو چکا ہے جو پاکستان میں مروج نظام زندگی کو اسلامی نہیں سمجھتا اور موجودہ نظام کو قوت سے بدل کر اسلامی نظام حیات کا نفاذ اپنی تعبیر شریعت کے مطابق کرنا چاہتا ہے۔ آج کل حکومت پاکستان اور اس عنصر میں جنگ جاری ہے تاہم کوئی جنگ بھی ہمیشہ جاری نہیں رہ سکتی اور جلد یا بدیر فریقین کو مفاہمت کی طرف آنا ہی پڑتا ہے چنانچہ حکومت پاکستان اور ان دینی عناصر کے درمیان جب بھی مذاکرات ہوئے نفاذِ

شریعت اور جمہوریت کا مسئلہ اس میں سرفہرست ہوگا اور یہ بحث چھڑے گی کہ کیا موجودہ جمہوری نظام اسلامی ہے؟ اور یہ کہ موجودہ نظام میں ایسی کیا تبدیلیاں لائی جائیں کہ یہ اسلامی لحاظ سے قابل قبول ہوجائے۔ بالفاظ دیگر موجودہ نظام کے ہوتے ہوئے شریعت کیسے نافذ کی جائے؟

دوسرے یہ کہ امریکہ و یورپ کا مؤقف یہ ہے کہ جمہوریت (ان کے ہاں کی [ملحدانہ وسیکولر] جمہوریت) ایسا طرز سیاست اورطرز زندگی (ہماری اصطلاح میں 'مقدس دین') ہے جسے سب کو اپنانا ہے طوعاً او کرھاً۔ چنانچہ ہمارے ہاں بہت سے دانشور اور اہل علم یہ سمجھتے ہیں کہ امریکہ نے افغانستان پر حملے کا جواز تراشنے کے لیے 9/11 اور اسامہ کو حوالے کرنے کا محض ایک بہانہ بنایا ورنہ اس کا حقیقی سبب یہ تھا کہ افغانستان میں ایک ایسا اسلامی طرز زندگی اور طرز حکمرانی پروان چڑھ رہا تھا جو مغرب کی جمہوریت اور تہذیب کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا لیکن وہ ماڈل اتنا حقیقی اور مؤثر تھا کہ علاقے کے دوسرے ممالک اس سے لازماً متاثر ہوتے جو امریکہ کو گوارا نہ تھا دوسرا بڑا سبب معاشی تھا اور امریکہ کی نظریں افغانستان کی قیمتی معدنیات اور کیسپین وسط ایشیائی ممالک کے تیل کے ذخائر پر تھیں چنانچہ اس نے اپنے مقامی طرز سیاست (جمہوریت) اور طرز زندگی کو (تہذیب مغرب) کو بچانے کے لیے افغانستان پر حملہ کرکے اس کا تورا بورا بنادیا اور اب وہ لگے ہاتھوں پاکستان کا کانٹا بھی نکالنا چاہتا ہے کیونکہ پاکستان نے بھی اس کی مرضی کے خلاف ایٹم بم بنالیا ہے اور وہ اپنی اسلامی ثقافت سے محروم ہونے کے لیے تیار نہیں۔

اس صورت حال میں یہ جائزہ لینا ضروری ہے کہ عالم اسلام اور خصوصاً پاکستان کے علماء کرام اور دینی عناصر نے مغربی جمہوریت میں اسلام کے بعض سیاسی اصولوں کی پیوند کاری کر کے 'اسلامی جمہوریت' کا جو نظام وضع کیا تھا اور مغرب کی ملحدانہ فکر وتہذیب کے جمہوری نظام کے ساتھ مفاہمت کا جو اجتہاد کیا تھا اس کا تجربہ کس حد تک کامیاب ہوا ہے؟ اور اگر وہ ناکام ہو چکا ہے تو کیا کسی متبادل حکمت عملی کی ضرورت ہے اور وہ کیا ہوسکتی ہے؟

مندرجہ بالا نکات کی روشنی میں اس موضوع پر غور کرنے کے لئے ہم نے اس مضمون میں مندرجہ ذیل مباحث پر قلم اٹھایا ہے:

۔ مغربی جمہوریت ہے کیا؟

۔ علماء اور دینی عناصر کی طرف سے مغربی جمہوریت میں بعض اسلامی اصولوں کی پیوند کاری سے 'اسلامی جمہوریت' کی تشکیل

۔ پاکستان میں 'اسلامی جمہوریت' کے تجربے کی کامیابی یا ناکامی کا جائزہ

۔ مسلم معاشرے کے سیاسی نظام کے حوالے سے مستقبل کا لائحہ عمل

مطالعہ مغرب کی اہمیت

اسلام اور جمہوریت کی بحث کا ایک اہم نقطہ یہ ہے کہ مغربی جمہوریت ہے کیا؟ کیونکہ جب تک ہم یہ نہ جان لیں کہ مغربی جمہوریت کی حقیقت کیا ہے ہم اس کی اسلامی حیثیت کے بارے میں کوئی درست رائے قائم نہیں کر سکتے۔ لیکن اس حوالے سے ہماری کوتاہی یہ ہے کہ مسلم معاشرے میں عموماً اور پاکستان میں خصوصاً مطالعۂ مغرب کی روایت بہت کمزور ہے۔ اِس وقت صورت حال یہ ہے کہ مسلم معاشرے کو جو مسائل درپیش ہیں وہ بڑی حد تک مغربی فکر و تہذیب کے اثرات کا نتیجہ ہیں لیکن اس سے بڑھ کر ستم ظریفی کیا ہوگی کہ ہمارے دانشور، مفکر، ادیب، صحافی اور اساتذہ بالعموم اور ہمارے علماء کرام اور اسلامی سکالرز بالخصوص مغربی تہذیب کا نہ تو گہرا مطالعہ رکھتے ہیں اور نہ اس کی فکری اور فلسفیانہ بنیادوں کو اچھی طرح سے سمجھتے ہیں۔ جب وہ اسے سمجھتے ہی نہیں تو وہ اس کے شرعی یا غیر شرعی ہونے یا اس کے ردّ و قبول کا فیصلہ کیسے کر سکتے ہیں یا اس کے چیلنج سے کیسے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں؟

اپنی تاریخ پر ایک نظر ڈال کر دیکھ لیجئے کہ امت پر یونانی فکر و تہذیب کے حملے کو پسپا کرنے کے لئے امام غزالیؒ نے پہلے یونانی فلسفے کو سمجھا اور 'مقاصد الفلاسفۃ' لکھی اور پھر اس کا رد کیا اور 'تہافۃ الفلاسفہ' مدون کی۔ لہٰذا یہ ہمارے تعلیمی کارپردازوں کی ذمہ داری تھی کہ وہ مغربی فکر و تہذیب کے مطالعے اور اس پر اسلامی نقطۂ نظر سے نقد کو نصابات کا حصہ بناتے لیکن ہمارے دینی مدارس کے ذمہ داران اور جدید تعلیم کے کارپردازان دونوں نے اس کا کماحقہ احساس نہیں کیا۔ جہاں تک ہمارے معاشرے میں پالیسی ساز حکمرانوں اور مقتدر طبقات کا تعلق ہے تو ہم ان سے کیا گلہ کریں اور کیا توقع رکھیں کہ ان کی تو اپنی آنکھیں مغربی تہذیب کی چکاچوند سے خیرہ ہو چکی ہیں وہ دوسروں کی کیا رہنمائی کریں گے۔ حالانکہ اس بات کی فوری ضرورت تھی اور اب بھی ہے کہ مغربی فکر و تہذیب اور اسلامی تناظر میں اس کے محاکمے کے مطالعہ کو سارے دینی مدارس اور کالجوں یونیورسٹیوں

خصوصاً دینی مدارس کے فقہ و افتاء کے تخصص اور یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے علوم اسلامیہ میں لازمی قرار دیا جائے تا کہ ہمارے دینی سکالرز اور علماء کرام مغربی فکر و تہذیب کے حسن و قبح کے حوالے سے ایک متوازن رائے قائم کر سکیں ۔ اس امر کی بھی اشد ضرورت ہے کہ ہمارے ہاں مطالعۂ مغرب کے لئے تھنک ٹینک قائم ہوں ، یونیورسٹیوں اور اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں ریسرچ سنٹرز اور چیئرز قائم ہوں اور ایم فل و پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالات اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر لکھے جائیں۔

مغربی تہذیب کی فکری بنیادیں

جن لوگوں نے مغرب کی فکری تحریکوں (تحریک نشأۃ ثانیہ،تحریک اصلاح مذہب،تحریک تنویر،تحریک جدیدیت اور پس جدیدیت وغیرہ) اور ان کے اہم فکری تصورات (جیسے ہیومنزم،سیکولرزم،کیپٹل ازم،ایمپریسزم،۔۔۔۔۔۔ وغیرہ) کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ مغربی معاشرے میں عیسائیت کے اثرات برائے نام ہیں اور جن نظریات نے ان کی موجودہ تہذیب کی صورت گری کی ہے(اور جو ہماری روایت اور اصطلاح کے مطابق ان کا ''دین'' ہیں —— گو اہل مغرب ان کے لئے دین یا مذہب کا لفظ استعمال نہیں کرتے) ان میں سے ایک ہیومنزم (Humanism) ہے جس کی رو سے انسان خود مختار بلکہ مختارِ کل ہے اور کسی خدا کا عبد نہیں ہے جس کی اطاعت اس پر لازم ہو۔ ان میں سے ایک سیکولرزم (Secularism) بھی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی نے خدا کو ماننا ہے تو اپنی ذاتی زندگی میں مان لے لیکن اس خدا کو بہرحال ہماری اجتماعی زندگی یعنی سول سوسائٹی اور ریاستی امور میں مداخلت کا کوئی حق نہیں۔ کیپٹل ازم (Capitalism) بھی ان میں سے ایک ہے جس کے مفاہیم و تصورات کا خلاصہ یہ ہے کہ زندگی بس اس دنیا ہی کی زندگی ہے، یہی ساری انسانی کوششوں کا مرکز و محور ہونی چاہئے ۔ یہاں زیادہ سے زیادہ کسب مال اور سہولتوں کا حصول ہی مقصد زندگی ہونا چاہئے۔ اس کے لئے جائز و ناجائز کی کوئی قید نہیں، سود کی اجازت ہے، لامحدود حق ملکیت اور استحصال کی اجازت ہے۔ دوسرے لفظوں میں کیپٹل ازم کا مطلب ہے حبِّ دنیا اور حبِّ مال، نیز تصور آخرت کا فقدان اور حلال و حرام کی عدم تمیز۔ مغربی تہذیب کی صورت گری کرنے والے افکار میں سے ایک اہم ایمپریسزم (Empiricism) بھی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ حتمی اور یقینی علم صرف وہ ہے جو مشاہدے اور

تجربے پر مبنی ہو،جس کا منبع عقل اورحواس ہوں، باقی سب توہمات ہیں۔

گویا ہیومنزم اورسیکولرزم کا مطلب ہے انسان کی خودمختاری، اس کے عبد ہونے کی نفی اور اللہ اور اس کے اختیارات کا انکار۔کیپٹل ازم کا مطلب ہے حبِّ دنیا اور حبِّ مال کی بالادستی اور آخرت کی نفی۔ایمپیریسزم کا مطلب ہے قرآنی ہدایت اوروحی کا انکار۔اگر یہ سب الحاد اور کفر نہیں تو اور کیا ہے؟ اوراس پر مستزاد اہل مغرب کی اسلام دشمنی،مسلمانوں کے خلاف سازشیں ،ان کے علاقوں پر قبضہ کرنا، ان کوغلام بنانا ،ان کے وسائل کا استحصال کرنا،ان کے معاشی ،معاشرتی ،تعلیمی،قانونی۔۔۔۔۔اداروں کا خاتمہ اوران کےنظم اجتماعی کے سارے ڈھانچے کی شکست وریخت اور اس کی جگہ مغربی فکروتہذیب کے مطابق اجتماعی اداروں کا قیام تاکہ مسلمان ہمیشہ ان کے غلام رہیں اور ان کی تہذیب(یعنی ان کے دین)کے رسیا اور خوگر ہو جائیں۔یہ ہے وہ ورلڈ ویو اورفکری اساسات جن پرمغربی تہذیب کی عمارت کھڑی ہے۔

مغربی جمہوریت کی حقیقت

مغربی تہذیب کی جن ملحدانہ فکری اساسات کی طرف ہم نے سطورِ بالا میں اشارہ کیا ہے ان کے مطابق جب ان کے ہاں اجتماعی ادارے تشکیل دیئے گئے اور ان کا تفصیلی ڈھانچہ ترتیب دیا گیاتومنطقی طور پر وہ ان ملحدانہ افکار ہی کا عکاس اورعلم بردار تھا چنانچہ مغرب کے سیاسی نظام کو دیکھیے، اس کا اہم ستون ہے ڈیموکریسی (Democracy) جس کا ترجمہ ’جمہوریت‘ سے کیا جاتا ہے

اورمغرب کی اس جمہوریت کے چار اہم تصورات ہیں:

۱۔ پارلیمنٹ کی بالادستی، ۲۔آئین کی برتری ۳۔ووٹ کی مساوات؛ اور ۴۔امیدواری سسٹم

آیئے اب ہم ان تصورات کی حکمت اورکنہ کوسمجھنے کی کوشش کرتے ہیں:

پارلیمنٹ کی بالادستی

مغرب میں پارلیمنٹ اس لئے بالادست ہے کہ وہاں افرادیعنی عوام کے نمائندے بیٹھتے ہیں جو اپنی اجتماعی حیثیت میں انہی خصوصیات کے حامل ہیں جن کا حامل وہاں کا فردہےیعنی وہ بھی مختارِ مطلق ہیں۔چنانچہ پارلیمنٹ کے ارکان جو قانون چاہیں بنا سکتے ہیں،جس چیز کو چاہیں حلال اور جسے چاہیں

حرام قرار دے سکتے ہیں اور اسی پس منظر میں مغربی ممالک کے پارلیمان شراب نوشی، جوئے، فحاشی، زنا اور لواطت وغیرہ کو حلال قرار دے چکے ہیں۔

آئین کی برتری

مغرب کے سیاسی نظام میں آئین اس لئے مقدس اور بالادست ہوتا ہے کہ اسے عوام کے نمائندوں نے بنایا ہوتا ہے اور وہ عوام کی مرضی کا مظہر ہوتا ہے اور عوام چونکہ مختارِ مطلق ہیں اس لئے ان کا بنایا ہوا دستور بھی مقدس ہوتا ہے۔ اسے نہ ماننے اور اس کی خلاف ورزی کرنے کی سزا بالعموم عمر قید یا موت ہوتی ہے۔ ساری عدالتیں اسی آئین کے مطابق فیصلے کرنے کی پابند ہوتی ہیں، پارلیمنٹ میں سارے قوانین اسی کے مطابق بنتے ہیں اور حکمران (انتظامیہ) اپنے اختیارات اسی کے تحت بروئے کار لاکر ریاست کا نظم و نسق چلاتے ہیں۔

ووٹ کی مساوات

ووٹ کی مساوات کا اصول بھی ہیومنزم اور فرد کی خودمختاری پر مبنی ہے کہ ہر فرد ایک جیسا خودمختار ہے اس لئے سیاسی رائے دہی کے حوالے سے سب افراد برابر ہیں خواہ کوئی جاہل اور بدقماش ہو یا متقی اور عالم۔

امیدواری سسٹم

امیدواری سسٹم کی اساس بھی یہی ہے کہ چونکہ ہر فرد خودمختار ہے اور ریاستی امور چلانے کے لئے حصول اختیار و اقتدار کا مساوی حق رکھتا ہے لہٰذا کسی دینی، اخلاقی اور تعلیمی معیار سے قطع نظر ہر شخص عوام کی نمائندگی کا حق رکھتا ہے اور پیسے خرچ کرکے' اپنی تعریفیں اور کارنامے بیان کرکے اور اپنے خاندان و برادری کا واسطہ دے کر لوگوں سے ووٹ مانگ سکتا ہے اور یہ کہہ سکتا ہے کہ میں تمہاری نمائندگی کا دوسروں سے زیادہ اور بہتر حق دار ہوں لہٰذا مجھے اقتدار تک پہنچاؤ، میں دوسروں سے بہتر انداز میں تمہارے مسائل حل کروں گا۔

اسلامی تناظر میں مغربی جمہوریت کا جائزہ

اب آپ ان سیاسی نظریات و تصورات کا اسلامی تناظر میں جائزہ لے کر دیکھیے تو آپ بلا تردد جان

لیں گے کہ یہ بحیثیت مجموعی بھی اور ان کا ایک ایک جزء انفرادی طور پر بھی غیر اسلامی ہے۔ خود جمہوریت عربی لفظ ہے اور جمہور کا لفظ (بمعنی اکثریت) اسلامی لٹریچر میں اکثر استعمال بھی ہوتا ہے تاہم جمہوریت کا لفظ بطور سیاسی اصطلاح کے اسلام کے دینی لٹریچر میں کبھی بھی استعمال نہیں ہوا کیونکہ وہاں جمہور کی حاکمیت کا تصور موجود ہی نہیں۔ اس کی بجائے قرآن وسنت میں شوریٰ (مشورے) کا لفظ استعمال ہوا ہے یعنی حاکمیت اللہ کی (یا بالفاظ دیگر اس کے 'قانون' کی جسے 'شریعت' کہا جاتا ہے) اور نظام حکومت کا چلانا مسلمانوں کے باہمی مشورے سے۔

مغربی جمہوریت کا پہلا اصول پارلیمنٹ کی بالادستی کا ہے۔ وہاں پارلیمنٹ اس لئے بالادست ہے اور اسے حلال وحرام کے تعین کا اور بلاشرط وقید جو قانون چاہے بنا لینے کا اس لئے حق حاصل ہے کہ وہاں ہیومنزم اور سیکولرزم کی رو سے فرد خود مختار بلکہ مختارِ مطلق ہے اور اللہ کو اجتماعی زندگی میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ لہٰذا ان مختارِ مطلق افراد کے جو نمائندے اجتماعی معاملات طے کرنے کے لئے پارلیمنٹ میں پہنچیں گے وہ بھی خود مختار اور مختارِ مطلق ہوں گے اور بلاشرط وقید جو فیصلے چاہیں گے کر سکیں گے اور کسی الٰہی ہدایت یا کتابِ منزّل کی پیروی ان پر لازم نہیں ہوگی کیونکہ وہ کسی ایسے الہ کو مانتے ہی نہیں جس کے وہ عبد ہوں اور اجتماعی زندگی گزارنے کے لئے جس کے احکام پر عمل درآمد ان کے لئے ضروری ہو۔ یہ اصول، ظاہر ہے، سو فیصد غیر اسلامی ہے اور مسلمانوں کا کوئی اجتماعی ادارہ (خواہ وہ پارلیمنٹ ہو، عدالت ہو یا انتظامیہ ہو) کبھی ان معنوں میں خود مختار نہیں ہوسکتا کہ وہ جو چاہے فیصلے کرے اور جو چاہے قانون بنائے اور اسے کسی الٰہی ہدایت کی پابندی اور پیروی کی ضرورت نہ ہو۔

مغربی جمہوریت کا دوسرا اصول آئین کی بالادستی کا ہے۔ آئین وہ بنیادی قانون یا بنیادی اصولوں کا مجموعہ ہوتا ہے جس کے مطابق ریاست اور معاشرے کا اجتماعی نظام چلایا جاتا ہے۔ مغرب میں چونکہ فرد مختارِ مطلق ہے لہٰذا اس کے نمائندے بھی مختارِ مطلق ہیں اور جیسا آئین چاہیں بنا سکتے ہیں۔ اس آئین کو تقدس حاصل ہوتا ہے اور اس کی خلاف ورزی کی سزا عمر قید یا موت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے یہ اصول اسلام کے سو فیصد خلاف ہے کیونکہ اسلام میں نہ فرد مختارِ مطلق ہے اور نہ اس کے نمائندے۔ بلکہ اللہ مختارِ مطلق ہوتا ہے یا بالفاظ دیگر اس کی وہ ہدایت اور شریعت مختارِ مطلق ہوتی ہے جو وہ اپنی کتاب (قرآن حکیم) اور پیغمبر (کی سنت) کی صورت میں بھجواتا ہے۔ لہٰذا اسلام میں قرآن وسنت کو آئین کی سی بالادست حیثیت حاصل ہوتی ہے اور اس کو چیلنج یا رَد کرنا سزائے موت کا

سبب ہوتا ہے (ارتداد کی سزا)۔ گویا افراد کے بنائے ہوئے آئین کے تقدس اور بالادستی کا اصول بھی غیر اسلامی ہے کیونکہ اس کے برعکس اسلام اللہ اور شریعت کی بالادستی کا مدعی ہے نہ کہ انسانوں کے مختارِ مطلق ہونے اور ان کے نمائندوں کے بنائے ہوئے آئین کے مقدس اور حتمی ہونے کا۔

یہاں ضمناً یہ بھی جان لیجئے کہ پارلیمنٹ اور آئین کی بالادستی میں پنہاں مغربی جمہوریت کا یہ اصول بھی غیر اسلامی ہے کہ اکثریت کا فیصلہ صحیح ہوتا ہے کیونکہ پارلیمنٹ میں خواہ آئین سازی کا مسئلہ ہو یا قانون سازی کا، بعض اوقات عوام کے سارے نمائندے کسی معاملے پر متفق نہیں ہو پاتے چنانچہ وہاں اکثریت کی عصمت کے اصول پر عمل ہوتا ہے کہ صحیح وہ ہے جو اکثریت کا فیصلہ ہو۔ یہ اصول اس لئے غیر اسلامی ہے کہ اسلام میں حق وہ ہے جو اللہ کی طرف سے آئے، بندوں کی قلت و کثرت کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اگر ساری دنیا کے مسلمان (اور سارے مسلم ممالک کے پارلیمان) مل کر یہ فیصلہ کردیں کہ شراب پینا جائز ہے تو کیا یہ جائز ہوجائے گی؟ اور کیا انہیں یہ فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ مغربی جمہوریت کا اکثریت کے صحیح ہونے کا تصور ایک باطل تصور ہے اور اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ لاکھوں کروڑوں لوگوں کی رائے، اگر وہ قرآن وسنت کے کسی واضح اور صریح حکم کے خلاف ہو، تو وہ غلط ہوگی اور اس ایک آدمی کی رائے صحیح ہوگی جو قرآن وسنت کے حکم کے مطابق ہو۔ لہٰذا اسلام میں افراد کی قلت و کثرت معیار حق نہیں، معیار حق صرف اللہ اور اس کی شریعت ہے۔ ہاں! اجتماعی، اجتہادی اور انتظامی امور میں کثرت رائے کو رفع نزاع کے لئے اختیار کیا جاسکتا ہے کیوں کہ اس سے کسی حکم الٰہی کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔

مغربی جمہوریت کا تیسرا اصول کہ ہر آدمی کا ووٹ برابر ہے، بھی خلاف اسلام ہے کیوں کہ قرآن حکیم کی رو سے سب انسان ایمانی، اخلاقی اور عقلی لحاظ سے برابر نہیں ہیں بلکہ جو متقی ہیں وہ دوسروں سے افضل ہیں۔ سیاسی اور اجتماعی امور میں مشاورت کے زیادہ حق دار بھی وہ لوگ ہیں جو ایمان و اخلاق، عقل و تدبّر اور عوامی اثر و رسوخ میں دوسروں سے بڑھ کر ہوں۔ تاہم ایسے معاملات میں جن کا تعلق عامۃ الناس سے ہو وہاں عوام کی رائے بھی لی جاسکتی ہے جس کا مظہر مسلمانوں کے سیاسی نظام میں بیعت عامہ کا تصور ہے۔ بایں ہمہ یہ بات اپنے عمومی اطلاق میں صحیح نہیں ہے کہ سب کی رائے کا وزن بھی ایک جیسا ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اکثر و بیشتر اجتماعی معاملات میں حضرت ابو

بکر و عمرؓ سے مشاورت پر اکتفا کرتے تھے اور بعض اوقات دیگر کبار صحابہ سے رائے بھی لے لیتے تھے۔ بلاشبہ بعض معاملات میں وسیع مشاورت کا بھی آپ ﷺ نے اہتمام کیا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ حضرت ابو بکرؓ کی رائے اور ایک بدو کی رائے برابر تھی۔ خلافت راشدہ میں عام آدمی کی رائے بھی (بیعتِ عامہ کی صورت میں) لی جاتی تھی لیکن حکومت کے بننے بگڑنے میں بنیادی ہاتھ اصحاب الرائے اور اہل الحل والعقد کا ہوتا تھا۔ چنانچہ ثقیفہ بنی ساعدہ میں اکابر صحابہ کرامؓ نے پہلے یہ طے کیا کہ فرمان نبوی کے مطابق مسلمانوں کا امیر جمہور امت میں سے نہیں صرف مہاجرین میں سے ہوگا۔ پھر انہی میں سے بعض نے حضرت ابوبکرؓ کا اسمِ گرامی تجویز کیا اور ان کی بیعت کی۔ اس کے بعد عام لوگوں نے بھی بیعت کر کے اس فیصلے کی حمایت کی۔ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے خلیفہ بنتے وقت بھی ایسے ہی ہوا اور حضرت علیؓ کے پاس جب لوگ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد آئے اور اصرار کیا کہ آپؓ خلافت سنبھالیں تو آپؓ نے کہا کہ میں تمہاری بات کیسے مان لوں؟ جب انہوں نے اصرار کیا تو کہا، اچھا! اصحابِ بدر کے پاس جاؤ اگر وہ آ کر مجھے کہیں گے تو پھر میں غور کروں گا۔ علامہ اقبال نے مغربی جمہوریت کے ووٹ کی مساوات کے اسی ناقص اصول پر طنز کرتے ہوئے کہا تھا کہ ؎

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنِا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

اس اصول کے غلط اور ناکام ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہم سب کا یہ مشاہدہ ہے کہ پاکستان میں پچھلے ۶۴ سال سے افراد کے ووٹ کی برابری کا مغربی جمہوریت کا اصول نافذ ہے لیکن انتخابات کے نتیجے میں ہمیشہ سرمایہ دار اور جاگیر دار ہی منتخب ہو کر برسر اقتدار آتے ہیں اور ہماری بلدیاتی، صوبائی اور قومی اسمبلیوں میں غریب اور متوسط طبقے کے اسلام پسند عوام کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر ہے اگرچہ وہ بہت بڑی اکثریت رکھتے ہیں۔

مغربی جمہوریت کا چوتھا اصول عوام کی نمائندگی اور اقتدار کے حصول کے لئے امیدوار بننے کا ہے۔ چونکہ مغربی تصورات کے مطابق دین و اخلاق کا اجتماعی سیاسی زندگی سے کوئی تعلق نہیں (سیکولرزم) اور ہر فرد ایک جیسا خود مختار ہے (ہیومنزم) لہٰذا ہر فرد کو نمائندہ بننے کا حق حاصل ہے

اور چونکہ وہاں فرد کے نزدیک دنیا ہی اہم ہے (آخرت نہیں) اور دنیا میں زیادہ سے زیادہ مال کمانا اور زیادہ سے زیادہ سہولتیں اور آسائشیں حاصل کرنا ہی مقصد زندگی ہے (کیپٹل ازم) لہٰذا ہر فرد کو امیدوار بننے، اپنی خوبیاں بیان کرنے، اپنے حق میں دولت خرچ کرنے، پروپیگنڈہ مہم چلانے اور کامیاب ہوکر پارلیمنٹ میں پہنچنے اور اقتدار حاصل کرنے کا حق حاصل ہے۔اس کے برعکس اسلام چونکہ منزّل من السماء دین ہے اور اخلاقی اقدار کا لحاظ رکھنا اس کا بنیادی جزو ہے لہٰذا وہ اقتدار کی حرص و ہوس سے فرد کو بچانا چاہتا ہے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہم منصب اور اقتدار اس شخص کو نہیں دیتے جو اس کا طلب گار ہو اور یہ بھی فرمایا کہ جسے منصب و اقتدار بے طلب ملا اسے اللہ کی نصرت حاصل ہوتی ہے ۔ اسی لئے اسلام میں امیدواری سسٹم ناجائز ہے اور خلافت راشدہ میں کسی خلیفہ نے اپنے آپ کو اقتدار کے لئے پیش نہیں کیا اور امام ماوردی وغیرہ جن ماہرین علم السیاست نے مسلمانوں کے سیاسی اور ریاستی امور پر تفصیلی بحث کی ہے ان کے نزدیک بھی خلیفہ کا انتخاب امت کے اہل حل وعقد کا کام ہے — جو تقویٰ وصلاحیت کی بنیاد پر اس کا انتخاب کرتے ہیں اور کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ اس کے لئے خود امیدوار بننا اور اپنے پیسوں اور وسائل سے مہم چلانا جائز ہے۔

مغربی جمہوریت میں اسلام کی پیوندکاری سے 'اسلامی جمہوریت' کی تشکیل

سطور بالا میں ہم نے مغربی جمہوریت کے خلاف اسلام ہونے کی جو بات کی ہے ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے علماء وسکالرز کی اکثریت اس سے اتفاق کرتی ہے لیکن اس کے باوجود انہوں نے مغرب کے جمہوری نظام میں اسلام کے چند سیاسی اصولوں کی پیوندکاری سے اسے 'اسلامی جمہوریت' کہہ کر قابل قبول قرار دے دیا تو اس کا جواز ان کے نزدیک یہ ہے کہ خلفاء راشدین کے بعد خلافت (یعنی مسلمانوں کا سیاسی وریاستی نظام) اگرچہ منہاجِ نبوت کے سو فیصد مطابق نہ رہا لیکن اسلامی اصولوں کے قریب تر رہتے ہوئے وہ ان کی سیاسی مرکزیت کا منبع اور مظہر ضرور رہا لیکن 1924ء میں مغربی تہذیب سے مرعوب ومتاثر ترک رہنما مصطفیٰ کمال اتاترک نے پہلی جنگِ عظیم کے بعد جب اس بری بھلی خلافت کا بھی خاتمہ کر دیا اور دوسری جنگِ عظیم کے بعد جب مسلمان ممالک مغربی استعمار کی غلامی سے آزاد ہونا شروع ہوئے تو مسلمان علماء وسکالرز کے سامنے اب سوال یہ تھا کہ مسلم ممالک کا

نیا سیاسی ڈھانچہ کیسا ہو؟ اس مرحلے پر مسلم حکمرانوں نے جن کی اکثریت استعماری اداروں کی تربیت یافتہ تھی اور ان کی حمایت سے برسر اقتدار آئی تھی اور جو بالعموم مغربی فکر وتہذیب کی رسیا اور اس سے مرعوب تھی اور اقتدار کے حصول، اس کی بقاء اور استحکام کے لئے مغرب کی آلہ کار اور گماشتہ بننے پر رضامند تھی، مغربی فکر وتہذیب کو اپنانے، اسے مسلم ممالک میں رائج کرنے اور اپنے اجتماعی ادارے مغربی فکر وعمل کے مطابق بنا لینے میں عافیت جانی اور مغربی فکر وتہذیب سے مرعوب صحافیوں، ادیبوں اور دانشوروں نے بھی ان کی حمایت کی۔ دینی قیادت کے سامنے اب یہ ایک چیلنج اور عملی سوال تھا کہ اسلامی نقطۂ نظر سے اب وہ کیا لائحہ عمل اختیار کریں؟ ایک راستہ تو یہ تھا کہ مغربی اداروں کی نقالی میں بننے والے ان اداروں کو وہ غیر اسلامی قرار دے کر رَد کر دیں لیکن اس میں انہیں خدشہ یہ تھا کہ اگر وہ اجتماعی اموراور سیاسی حالات سے عملاً الگ تھلگ رہے تو مغرب سے مرعوب حکمران اور دانشور مسلم معاشرے کو بلا روک ٹوک غیر اسلامی مغربی تہذیب کے راستے پر چلاتے چلے جائیں گے۔

دوسرا راستہ یہ تھا کہ مغرب کے سیاسی اداروں کو بعینہٖ قبول کر لیا جائے۔ظاہر ہے یہ علماء و سکالرز کے لئے قابل قبول نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے تئیں بیچ کا تیسرا اور معتدل راستہ یہ نکالا کہ جدو جہد کر کے اور مسلم حکمرانوں کو مجبور کر کے مغرب سے مستعار اس سیاسی نظام (جمہوریت) میں اسلامی حوالے سے کچھ بنیادی تبدیلیاں کرا لی جائیں اور پھر اسے قبول کر کے اس کی مزید اصلاح اور اسے اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھالنے کی جدوجہد جاری رکھی جائے۔ ان تبدیلیوں کے بعد انہوں نے اس سیاسی نظام کو 'اسلامی جمہوریت' قرار دے دیا اور عملی سیاسی جدو جہد میں شامل دینی عناصر نے اپنی کوششوں کو 'اقامت دین'، 'اسلامی انقلاب'، 'نظام مصطفیٰ' اور 'نفاذِ شریعت' جیسے خوبصورت نام دے دیئے تا کہ انہیں مسلمان عوام کی حمایت حاصل کرنے اور اس نظام کو اسلام کے مزید قریب لانے میں آسانی ہو۔'اسلامی جمہوریت' کی اصطلاح وضع کرتے وقت وہ یہ بھی ملحوظ خاطر نہ رکھ سکے کہ فنی لحاظ سے یہ جمع بین الاضداد ہے اور مغرب کی کسی اصطلاح کو اس کے علمی، ثقافتی اور اجتماعی فکری دائرے سے کاٹ کر کسی دوسرے نظام فکر میں مدغم نہیں کیا جا سکتا اور نہ 'اسلامی' کا سابقہ لگا دینے سے غیر اسلامی افکار کی حامل کوئی اصطلاح اسلامی بن جاتی ہے اور نہ اس کا غیر اسلامی پس منظر اس سے خارج ہو جاتا ہے۔

'اسلامی جمہوریت' کی ناکامی کے اسباب ومظاہر

بعض علماء و سکالرز اور ہم عصر دینی جماعتوں اور اسلامی تحریکوں نے 'اسلامی جمہوریت' کا یہ جو راستہ اپنایا تھا اب اسے روبہ عمل آئے ہوئے نصف صدی سے زیادہ مدت گزر چکی ہے لہٰذا آج ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ اس کے نتائج کا جائزہ لے سکیں۔ ہماری رائے میں یہ تجربہ ناکام ہوگیا ہے اور امت کو اس کا سخت نقصان ہوا ہے۔ ہماری یہ رائے جس استدلال پر مبنی ہے اس کے دو پہلو ہیں: ایک فکری اور دوسرا عملی۔

فکری پہلو: مغربی جمہوریت اور اسلام کے سیاسی اصولوں کے باہم امتزاج کی یہ کوشش غیر منطقی اور اجتماع بین الضدین کے مماثل تھی اس لئے ناکام ہوگئی ۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے آگ اور پانی کو جمع کرنے کی کوشش کی جائے یا اس کی مثال دودھ میں ریت حل کرنے جیسی ہے کہ وہ باوجود کوشش کے حل نہیں ہوسکتی اور نہ پینے والے کو مفید نتائج دے سکتی ہے۔ مغرب کا ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم اور ایمپریسزم پر مبنی ورلڈ ویو اسلام کے ورلڈ ویو کے بالکل خلاف ہے، جیسا کہ ہم نے اس مضمون کے شروع میں بیان کیا ہے، لہٰذا یہ دو مختلف پیراڈائم ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف بلکہ متضاد ہیں اور ان میں سے کسی ایک کے ایک جزو کا دوسرے کے متعلقہ جزو میں ضم ہونا ممکن ہی نہیں۔ یہ عقلی اور منطقی طور پر محال ہے۔

عملی پہلو: جب اسلام اور مغربی تہذیب کے بنیادی فکری عناصر ایک دوسرے سے متضاد ہیں تو وہ باہم مل کر کوئی مفید مرکب بن ہی نہیں سکتے بلکہ اس کا لازمی نتیجہ فکری انتشار ہوگا جو نہ مستحکم شخصیت کو وجود میں آنے دے گا اور نہ تعمیر سیرت و کردار کا کوئی مستحکم سانچہ بننے دے گا جیسا کہ عملاً پاکستان اور مسلم دنیا میں ہوا ہے۔

اسلام اور مغربی جمہوریت کے اس انمل بے جوڑ ملاپ کے سیاسی اثرات یہ ہیں کہ عصر حاضر میں دنیا کے جن مسلمان ملکوں میں یہ 'اسلامی جمہوریت' آئی ہے وہاں اول تو وہ عناصر برسرِ اقتدار آ ہی نہیں سکے یا آنے نہیں دیئے گئے جو ریاست اور معاشرے میں اسلامی تعلیمات کے نفاذ کے خواہاں ہیں، خواہ وہ عوام میں مقبول ہی کیوں نہ ہوں۔ اور اگر کہیں آ بھی گئے ہیں تو وہ معاشرے میں کوئی بڑی اسلامی تبدیلی نہیں لا سکے —— اور ہمارے تجزیے کے مطابق لا ہی نہیں سکتے آمریتوں کے مارے

عرب ممالک میں عوامی انقلاب آ رہے ہیں ان میں اگرچہ اسلامی جماعتیں کامیاب ہو رہی ہیں لیکن یہ نتیجہ ہے ان کے ایثار، محنت اور قربانیوں کا جو انہوں نے اپنے مقاصد کے لیے دیے ہیں لیکن بعد از خرابیٔ بسیار جو جمہوریت ان کو مل رہی ہے دیکھنا یہ ہے کہ مستقبل میں اس کے اثرات کیا نکلیں گے۔ ہماری رائے میں اس کے نتائج وہی نکلیں گے جو ہمارے ہاں نکلے ہیں۔خود پاکستان کی مثال لے لیجئے: یہاں دوصوبوں میں دینی جماعتوں کے اتحاد ایم ایم اے کو اقتدار ملا لیکن چار سال میں وہ کچھ بھی نہ کر سکے۔ یہاں تک کہ اس عرصے میں وہ حسبہ بل جیسا وہ بنیادی قانون بھی پاس نہ کر سکے جس کی بنیاد پر وہ اس صوبے میں اسلامی تعلیمات نافذ کرنا چاہتے تھے (اگرچہ یہ بات خود مضحکہ خیز ہے کہ ایک حکمران اسلامی جماعت کو شریعت پر عمل کرنے کے لئے کسی 'حسبہ بل' کی ضرورت ہے)۔ یہی حال دوسرے مسلمان ممالک کا ہے۔

اسلام اور مغربی جمہوریت کے غیر فطری امتزاج کی ناکامی کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اس کے نتیجے میں کسی مسلمان ملک میں اسلام تو نہیں آیا البتہ وہاں مغربی تہذیب ضرور غالب آ گئی ہے۔ پاکستان کی مثال لے لیجئے یہاں سیکولر مغربی جمہوریت کو معمولی تبدیلیوں کے بعد 'اسلامی جمہوریت' قرار دے کر نافذ کرنے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آج ۶۴ سال بعد یہاں مغربی فکر و تہذیب غالب آ چکی ہے اور معاشرہ بڑی تیزی سے سیکولر ہو رہا ہے۔ کسی ایک شعبۂ زندگی کو لے لیجئے مثلاً تعلیم کو۔ اس وقت خود ان دینی جماعتوں کے افراد نے جو پاکستان میں نفاذِ شریعت کے علم بردار ہیں ایسی یونیورسٹیاں، کالج اور سکول کھول رکھے ہیں جن میں تعلیم مخلوط ہے، غیر مسلم و غیر پاکستانی مصنّفین کی کتابیں داخل نصاب ہیں، مغربی ممالک کے امتحانات دلوائے جاتے ہیں (جیسے او اور اے لیول اور سپلٹ ڈگری پروگرام) اور تربیت کا سارا ماحول مغربی ہے (مثلاً یونیفارم، ٹیبلو، ڈرامے اور دیگر غیر نصابی سرگرمیاں)۔ ابلاغ عامہ کے شعبے میں پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا میں مغربی اصول و اقدار کے مطابق بے حیائی، عریانی اور فحاشی سکہ رائج الوقت بن چکی ہے۔ سیاست میں سیکولرزم کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہوگی کہ ''اسلامی'' جمہوریہ پاکستان کے سب سے بڑے عہدہ دار اور ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کے سربراہ نے ایک تحریری معاہدے سے منحرف ہوتے ہوئے کہا کہ ''سیاسی معاہدے قرآن و حدیث کا حرف نہیں ہوتے''۔ اقتصادی زندگی کو دیکھیے کہ مغرب کے سرمایہ دارانہ

نظام کی پیروی کے نتیجے میں امیر دن بدن امیر تر اور غریب غریب تر ہوتے جا رہے ہیں، دولت کو عزت کا معیار سمجھا جاتا ہے، دنیا میں آگے بڑھنے کی دوڑ جاری ہے اور ہر فرد ہر قیمت پر زیادہ سے زیادہ دولت، آسائشیں اور سہولتیں حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ہر شخص معیار زندگی بلند کرنے کی دوڑ میں شامل ہے، راتوں رات امیر بننا چاہتا ہے اور رزق کمانے اور خرچ کرنے میں حلال وحرام کی پابندی عنقا ہے۔سماجی زندگی میں دیکھیے تو مغرب کی پیروی میں پاکستانی خاندان بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔نوجوان والدین سے بغاوت کر کے محبت کی شادیاں کر رہے ہیں، پردہ کم ہو رہا ہے، بوڑھے والدین کی خدمت بوجھ لگنے لگی ہے اور بڑے شہروں میں اولڈ ہومز کھل رہے ہیں۔طلاقوں کی کثرت ہو رہی ہے،لوگوں میں بے تعلقی بڑھ رہی ہے اوراعزہ و احباب کے ہاں جانے اور ان کے دکھ سکھ میں شریک ہونے کی بجائے ٹی وی کے آگے بیٹھ کر وقت گزارا جاتا ہے۔غرض جس شعبۂ زندگی کو چاہیں دیکھ لیں وہاں اسلامی اصول و اقدار کو پس پشت ڈالا جا رہا ہے۔اور مغربی تہذیب کے مظاہر اور تقاضوں پر عمل ہو رہا ہے۔

ہمارا سوال یہ ہے کہ پاکستانی معاشرہ جس تیزی سے مغربی تہذیب کو قبول کر رہا ہے،اپنے آپ کو مغربی اصول و اقدار کے مطابق ڈھال رہا ہے اور اسلامی اقدار جس سرعت سے زوال پذیر ہو رہی ہیں وہ کس چیز کا نتیجہ ہیں؟ اس کی بنیادی وجہ، ہمارے نزدیک، یہ ہے کہ ہم نے اپنے اجتماعی اداروں میں مغربی نظامِ فکر اور نظامِ حیات کو قبول کر لیا ہے اور اپنے اداروں میں مغربی اطوار کی نقالی کر رہے ہیں اور ان میں اسلام کا ایک آدھ پیوند لگا کر اس خود فریبی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اب یہ اسلامی ہو گئے ہیں۔جیسے ہم نے پاکستان میں مغرب کی سیکولر جمہوریت کو قبول کر لیا ہے اور اس میں اسلام کے چند پیوند لگا کر یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ اب یہ 'اسلامی جمہوریت' بن گئی ہے حالانکہ یہ پیوند غیر مؤثر ہیں اور یہ مؤثر ہو بھی نہیں سکتے کیونکہ ہیومنزم،سیکولرزم،کیپٹل ازم اور ایمپریسزم کی زمین میں اگر اسلام کا پودا لگایا جائے گا تو وہ اسلامی پھل نہیں دے سکتا لیکن خود فریبی میں مبتلا ہو کر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اسلامی پھل دے گا۔

مغرب کی مسلم ممالک میں نفاذ جمہوریت کی حمایت

یہاں ایک ضمنی لیکن اہم مبحث۔سوچنے کی بات یہ ہے کہ مغرب (یعنی امریکہ و یورپ) ہم

مسلمانوں کا اتنا ہمدرد کب سے ہو گیا ہے کہ وہ مسلم ممالک میں اسلامی جمہوریت یا بالفاظ دیگر اسلام کے سیاسی نظام کے نفاذ کی حمایت کرے گا؟ دراصل امریکہ اور یورپ جب مسلم ممالک میں جمہوریت کی حمایت کرتے ہیں بلکہ اس کے لئے علی الاعلان فنڈ زدیتے، ادارے قائم کرتے اور دیگر اقدامات کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی سیکولر جمہوریت کو دنیا بھر میں پھیلانا چاہتے ہیں اوراس لئے پھیلانا چاہتے ہیں کہ وہ اپنی فکر وتہذیب کو(جو ان کا 'دین' ہے — خواہ وہ اسے دین نہ بھی کہیں) عام کرنااور برآمد کرنا چاہتے ہیں۔ بالفاظ دیگر مغرب مسلم ممالک میں جمہوریت کو اس لئے فروغ نہیں دینا چاہتا کہ وہ مسلمانوں کا یا اسلام کا ہمدرد ہے بلکہ وہ صرف اس لئے ایسا چاہتا ہے کہ جمہوریت کے پردے میں وہ مسلم ممالک میں اپنی فکر پھیلا سکے اوراپنی تہذیب کو وہاں غالب کر سکے اور اپنے اس منصوبے میں اسے خوب کامیابی مل رہی ہے(جس کا ثبوت ہم سطور بالا میں پاکستان کے حالات کے حوالے سے دے چکے ہیں کہ یہاں جمہوریت کی وجہ سے ہر شعبے میں مغربی تہذیب غالب آرہی ہے) کیونکہ مسلم حکمرانوں، علما، اور دانشوروں میں سے اسے یہاں ایسے لوگ مل رہے ہیں جو مغرب کی سیکولر جمہوریت کو چند سطحی تبدیلیوں کے بعد 'اسلامی جمہوریت' قرار دینے اوراسے قبول کرنے پر تیار ہیں۔

علماء کرام نے ملحدانہ اور سیکولر مغربی جمہوریت کو بامر مجبوری قبول کیا اور اس میں چند اسلامی تبدیلیاں کرکے اسے بمشکل اپنے لیے قابل قبول بنایا کیونکہ ایسے مسلمان حکمران موجود نہ تھے جو علماء سے مل کر اسلام کے سیاسی نظام کی تشکیل نو کرتے اور خود دلی سے اسے نافذ کرتے۔ یہ اس معاملے کا ایک پہلو ہے اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ اہل مغرب کی خواہش اور پلاننگ بھی یہی تھی کہ مسلمان بعض معمولی اور غیر مؤثر تبدیلیوں کے ساتھ مغربی جمہوریت اپنالیں تاکہ اسلام کا صحیح، سچا اور مؤثر سیاسی نظام نافذ نہ ہوسکے اور کہیں عہد صحابہؓ جیسی کسی خلافت کا ماڈل سامنے نہ آجائے چنانچہ اوریا مقبول جان اپنے کالم 'حرفِ راز' میں کہتے ہیں کہ ''پچاس کی دہائی میں رینڈ کارپوریشن نے ایک رپورٹ مرتب کی تھی کہ اللہ کی شریعت، خلافت اور مسلمانوں کی بالادستی کو روکنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اُن کی مذہبی پارٹیوں کو مغربی جمہوری نظام کا حصہ بنادو اُن کے انقلاب کے غبارے سے ہوا نکل جائے گی''۔

پاکستان میں 'اسلامی جمہوریت' کی ناکامی کے اسباب ومظاہر اوراثرات ونتائج

پاکستان میں اسلامی جمہوریت کی ناکامی اور مغربی تہذیب کے غلبے کا مختصر ذکر سطور بالا میں ہو چکا تاہم جب ہم اصرار وتیقن سے یہ بات کہتے ہیں کہ اسلامی جمہوریت پاکستان میں ناکام ہوگئی ہے بایں معنی کہ اس کے نتیجے میں معاشرے میں اسلام نہیں آیا، شریعت نافذ نہیں ہوئی بلکہ اس کی بجائے معاشرہ سیکولر ہو گیا ہے اور مغرب کی معاشی، معاشرتی، تعلیمی، قانونی۔۔۔اقدار معاشرے میں غالب آگئی ہیں۔تو اس کے اسباب ومظاہر اور اثرات ونتائج پر ذرا تفصیلی گفتگو غیر ضروری نہ ہوگی:

۱۔مغرب کے حمایت یافتہ مسلم حکمرانوں نے مغربی جمہوریت کو اپناتے ہوئے اس میں بنیادی نوعیت کی اسلامی تبدیلیاں قبول نہیں کیں بلکہ محض نام کی اور سطحی تبدیلیاں قبول کیں اور جو تھوڑی بہت باتیں مانیں وہ بھی اس طرح مانیں کہ وہ غیر مؤثر رہیں مثلاً یہاں دینی قوتوں کے دباؤ پر 1948ء میں دستور ساز اسمبلی نے قرار دادِ مقاصد پاس کر دی اور اس میں اللہ کی حاکمیت، لوگوں کو اسلام کے مطابق زندگی گزارنے کے قابل بنانے اور خلاف اسلام قانون سازی نہ کرنے کا ذکر کر دیا لیکن اس قرارداد مقاصد کو دستور کا دیباچہ بنا دیا اور اس کے قابل نفاذ حصے کا جزو نہ بنایا اور ایک طویل عرصے بعد جب جنرل ضیاء الحق نے اسے قابل عمل نفاذ حصے کا جزو بنا بھی دیا تو اعلیٰ عدلیہ نے پھر بھی اپنی تشریحات سے اسے عملاً نافذ نہ ہونے دیا اور اعلیٰ عدلیہ اگر ایسا نہ کرتی تو بھی ہماری سیاسی قیادت میں وہ Political Will موجود ہی نہیں کہ وہ اخلاص اور جذبے سے ملک میں شریعت نافذ کرے۔

پھر ان اصولوں کو ریاست میں نافذ کرنے کے لئے جن اقدامات کی ضرورت تھی، وہ دستور میں طے نہ کئے گئے اور دینی قوتوں کے دباؤ میں آکر جو اقدامات کئے گئے وہ اس انداز میں کئے گئے کہ وہ مؤثر ثابت نہ ہو سکیں مثلاً اسلامی نظریاتی کونسل بنائی تو اس کا کردار مشاورتی رکھا تاکہ اس کے فیصلوں پر عمل کرنا لازم نہ ہو یا جو باتیں اسٹیبلشمنٹ نے دباؤ میں آکر قبول کرلیں ان پر عمل نہ کیا مثلاً جنرل ضیاء الحق نے ارکانِ اسمبلی کے انتخاب کے لئے آئین میں اخلاقی شرائط رکھیں لیکن انتظامیہ، عدالتیں، الیکشن کمیشن اور سیاسی جماعتیں کوئی بھی ان پر عمل نہیں کرتا اور کراتا۔ وقس علی ذلک

۲۔مغرب نے مسلم ممالک میں اپنے آلہ کار حکمرانوں اور اداروں (فوج، بیوروکریسی، صحافت،

☆ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان سکولوں کو فوج پڑاؤ کے طور پر استعمال کرتی ہے۔

خفیہ ایجنسیوں وغیرہ) کی مدد سے جمہوریت کے ذریعے اسلام پسند سیاسی قوتوں کو کہیں بھی کامیاب نہیں ہونے دیا جیسے مصر اور پاکستان میں اور اگر مزاحمت اور سازشوں کے باوجود وہ کہیں جیت گئیں تو انہیں اقتدار میں نہیں آنے دیا جیسے الجزائر میں اور اگر وہ کسی نہ کسی طرح اقتدار میں بھی آگئیں تو انہیں شدید دباؤ میں رکھا تاکہ وہ اچھی کارکردگی نہ دکھاسکیں اور اپنے مقاصد حاصل نہ کرسکیں جیسے ایران اور ترکی میں۔

۳۔اس دوران میں مغرب نے تعلیم وتربیت، الیکٹرانک و پرنٹ میڈیا، بنیادی حقوق، حقوق نسواں (ومن ایمپاورمنٹ)، مالی امداد، خاندانی منصوبہ بندی (پاپولیشن پلاننگ)، این جی اوز غرض بیسیوں خوبصورت ناموں سے اور پرامن ذرائع سے مسلمانوں کے دل و دماغ فتح کرنے کی کوششیں جاری رکھیں تاکہ وہ اسلامی تعلیمات سے دور رہیں اور مغربی فکرو تہذیب کے جال میں پھنس جائیں اور مغرب پرست حکمرانوں، بیوروکریسی، صحافیوں اور دانشوروں کے تعاون سے اس مقصد میں اسے خاصی کامیابی حاصل ہوئی۔

۴۔لیکن مغرب کی ان ساری سازشوں اور ان میں جزوی کامیابیوں کے باوجود بعض مسلم ممالک مختلف شعبوں میں آگے نکل گئے جیسے ملائیشیا مالی طور پر مستحکم ہوگیا، پاکستان نے ایٹم بم بنالیا، عراق سیاسی اور عسکری طور پر مضبوط ہوگیا، افغانستان اور ایران میں اسلامی انقلاب آگیا لہٰذا امریکہ کے لئے، جو اب دنیا کی واحد سپر پاور ہے اور یورپ کی قیادت بھی اس کے پاس ہے، یہ صورت حال قابل قبول نہ رہی اور اس نے اپنی زبردست فوجی قوت سے پہلے عراق کو تباہ و برباد کیا، پھر افغانستان کو تاخت و تاراج کیا، پھر لیبیا کو روندا اور اب پاکستان لپیٹ میں ہے اور ایران پر بھی شدید دباؤ جاری ہے۔

۵۔مغرب کی اس جارحیت کے نتیجے میں اُن دینی عناصر کو جو مغربی فکرو تہذیب سے مصالحت کی مذکورہ بالا اجتہادی پالیسی سے (جو 'اسلامی جمہوریت' اور 'اسلامی بنکنگ' وغیرہ کی قائل ہے) اختلاف رکھتے تھے اور اسے غیر اسلامی اور کفر سے مفاہمت سمجھ کر اسے رَد کرنے کا رجحان رکھتے تھے (جیسے مصر کی تحریک التکفیر والھجرۃ، حزب التحریر، القاعدہ، طالبان اور تحریک نفاذ شریعت محمدی وغیرہ) کو مغرب کی ننگی جارحیت کے نتیجے میں اس کی مزاحمت کا جواز اور عملی راستہ مل گیا

اور انہوں نے نہ صرف مذکورہ ملکوں میں امریکی اور مغربی استعمار کے خلاف 'عوامی جہاد' شروع کر دیا بلکہ مسلم معاشرے میں مغرب کے ان تہذیبی مظاہر کو بھی نشانہ بنانا شروع کر دیا جو دینی قوتوں کی مذکورہ بالا مصالحانہ پالیسی کے غیر مؤثر اور ناکام ہونے کی وجہ سے مسلم معاشرے میں در آئے تھے جیسے لڑکیوں کے سکول جلانا (جن کی مغربی تعلیم مسلمان عورت کو بے حیائی سکھاتی ہے) ☆، سی ڈی کی دکانیں جلانا (جہاں کی لچر فلمیں اور ڈرامے مسلم معاشرے میں فحاشی اور عریانی پھیلاتے ہیں) اور حجاموں کی دکانیں جلانا (جہاں مغربی تہذیب کی پیروی میں مسلمان داڑھی منڈواتے ہیں جو سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا استخفاف اور مخالفت ہے)۔ مغرب اور اس کی گماشتہ مسلم حکومتیں چونکہ قوت سے ان عناصر کو کچل دینے کی کوشش کر رہی ہیں اور ظاہر ہے ان عناصر کے پاس اتنی قوت نہیں کہ وہ ان کا مقابلہ کر سکیں لہٰذا وہ گوریلا جنگ اور فدائی حملوں پر مجبور ہو گئے ہیں۔ مغرب اور اس کے آلہ کار مسلم حکمران اسے انتہاپسندی اور دہشت گردی قرار دیتے ہیں اور انہیں کچلنے کے ساتھ ساتھ معاشرے میں انہیں بدنام کرنے کی کوشش بھی کر رہے ہیں۔ مسلم عامۃ الناس کی ہمدردیاں اگرچہ جہادی عناصر کے ساتھ ہیں لیکن اس کشمکش نے مسلم معاشرے میں جو مصائب اور مشکلات پیدا کر دی ہیں وہ ان سے خائف اور نالاں بھی ہیں۔

پاکستان کے شمال مغربی قبائلی علاقوں میں صورت حال مزید پیچیدہ اس لئے ہوگئی ہے کہ وہاں جہادی مسلمانوں کی مزاحمت اور اس پر گماشتہ حکومت کے قابو پانے کی کوششوں کے ساتھ ساتھ وہاں امریکہ نے نہ صرف براہ راست ہوائی حملے شروع کر دیئے ہیں بلکہ بھارت اور اسرائیل کی مدد سے وہاں مسلسل مداخلت کار بھی بھجوار ہا ہے جو مذکورہ جہادی عناصر کے بھیس میں یا ان کے اندر گھس کر مسلح کاروائیاں کر رہے ہیں۔ دوسری طرف اس نے پاکستانی حکومت کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ ان قبائلی علاقوں میں فوجی آپریشن کرے جس کے نتیجے میں مزاحمت کاروں اور مداخلت کاروں کے جوابی فدائی حملوں نے پاکستان کے حالات کو نازک تر بنا دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی پاکستان کے اندر امریکی مسلح تنظیموں نے اپنا جال پھیلا دیا ہے اور یوں پاکستان کو غیر مستحکم کرنے، اس کی ایٹمی قوت کو ختم کرنے اور اسے توڑنے کے امریکی اور بھارتی عزائم کھل کر سامنے آ گئے ہیں۔ یوں اسلامی جمہوریت کی ناکامی اور اس کے ذریعے اسلامی تعلیمات کو زندگی کے مختلف دائروں میں غالب نہ کر سکنے کے نتیجے

میں بعض ایسے گروہ وجود میں آ گئے جو بذریعہ قوت شریعت کے نفاذ کے علمبردار ہیں۔ اگر اس کو اسلامی جمہوریت کی ناکامی کا منطقی نتیجہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

مستقبل کا لائحہ عمل

مندرجہ بالا تجزیے کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلم معاشرے میں مغربی جمہوریت کے نفاذ کے حوالے سے جو دو نقطۂ ہائے نظر اور طریقہ ہائے کار (ایک مغربی جمہوریت میں اسلام کے بعض سیاسی اصولوں کی پیوند کاری سے 'اسلامی جمہوریت' کے ملغوبے پر عمل کرنے کا اور دوسرا اس کو ناکام دیکھ کر قوت سے تبدیلی لانے اور اسے جہاد قرار دے کر ریاست کی مزاحمت کرنے کا) ابھرے وہ دونوں ناقص، غیر متوازن اور غیر مفید ثابت ہوئے ہیں۔ اوّل الذکر طریقے (یعنی مغرب کی لادین جمہوریت میں چند سطحی تبدیلیوں سے اسے 'اسلامی جمہوریت' قرار دے کر سیاسی عمل میں حصہ لینے) کی ناکامی سے نہ صرف اسلامی تحریکوں، جماعتوں اور اداروں کے کارکنوں کی اسلامی اساس کمزور اور اخلاقی ساکھ مجروح ہوئی ہے بلکہ ان کی ناکامی کی وجہ سے مسلم معاشرہ بڑی تیزی سے دین سے دور ہو رہا ہے اور جدیدیت و مغربیت (دوسرے لفظوں میں مغربی فکر و تہذیب) کو قبول کرتا چلا جا رہا ہے۔ مغربی تہذیب کا سیلاب ہر گھر میں داخل ہو گیا ہے اور زندگی کے سارے شعبے (خصوصاً وہ جو دوسرے شعبوں کی صورت گری اور ذہن سازی کرتے ہیں جیسے تعلیم اور میڈیا) اس کی لپیٹ میں آ گئے ہیں۔ دوسری طرف جہادی عناصر کا منہج اس لئے احیائے اسلام اور مسلم فرد و معاشرے کی تعمیر و تشکیلِ نو کے لئے موزوں نہیں ہے کہ ایک تو وہ اس قدر طاقتور نہیں ہیں کہ مغرب اور مسلم ریاست کو میدانِ جنگ میں شکست دے سکیں۔ دوسرے ان کا نقطۂ نظر مین اسٹریم اسلام (اسلام کے مرکزی دھارے) اور 'جمہور' کے منہج کے خلاف ہے (اگرچہ دفاعی جہاد یا دفاع وطن کی اجازت اسلام کے علاوہ دنیا کا ہر قانون یہاں تک کہ اقوام متحدہ کا چارٹر بھی دیتا ہے لیکن حکومت کے بغیر پرائیویٹ جماعتیں بنا کر جہاد کرنا، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لئے طاقت استعمال کرنا اور غیر صالح مسلم حکومت کے خلاف خروج اور مسلح مزاحمت جیسے مسائل میں جہادی اصحاب کا نقطۂ نظر جمہور کے برعکس اقلیتی نقطۂ نظر ہے) اور پھر ان لوگوں کے پاس مسلم فرد و معاشرے کی تعمیر و تشکیلِ نو کے لئے کوئی سنجیدہ منصوبہ بندی اور ٹھوس متبادل حکمت عملی بھی نہیں ہے۔

ان حالات میں اب ضرورت اس بات کی ہے کہ عصر حاضر میں سیاسی نظام کی اسلامی تشکیل نو کے اجتہادی معاملے میں نئی حکمت عملی اختیار کی جائے اور امت کے اہلِ علم اور اصحابِ فکر ونظر کسی متبادل کے امکانات پر غور کریں۔ ہماری طالب علمانہ رائے میں متبادل حکمت عملی یہ ہوسکتی ہے کہ پرائیویٹ سیکٹر کو منظم کر کے ذہن سازی اور انسانی فکر وعمل کی صورت گری کرنے والے شعبوں یعنی تعلیم وتربیت اور میڈیا کی دو اصولوں پر تشکیل نو کی جائے۔ ایک اسلامی اصولوں کا تتبع (اس طرح کہ وہ عصری مسائل کو حل کرے) اور دوسرے مغربی فکر وتہذیب کا رد۔ اور پھر ان کے ذریعے مسلم فرد کی تعمیر نو کی جائے اور اسے مستقبل کی صورت گری کے لئے (بطور Change Agent) استعمال کیا جائے۔ ہم نے ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ میں اپنے ایک مضمون میں اس مجوزہ نئی حکمت عملی کے خدوخال تفصیل سے بیان کئے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ نئی حکمت عملی میں سسٹم کو تبدیل کرنے کی بجائے فرد کی تبدیلی کو اساس بنایا جائے اور اس کے لئے تعلیم وتربیت اور میڈیا پر فوکس کیا جائے۔ عصری تناظر میں اسلامی حوالے سے یہ کام خاموشی سے، منصوبہ بندی اور پُر امن طریقے سے اور مغربی فکر وتہذیب کو علمی، فکری اور تہذیبی سطح پر رَد کرتے ہوئے کیا جائے۔ ہماری رائے میں یہ حکمت عملی قرآن وسنت کے زیادہ قریب ہے اور اس کے نتائج، ان شاء اللہ، زیادہ دیر پا ہوں گے، گو فوری نہ ہوں۔ اس دوران 'اسلامی جمہوریت' والی پالیسی عارضی طور پر جاری رکھی جاسکتی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ نئی تبدیلی پُر امن طریقے سے اور بتدریج آئے تاکہ معاشرہ تلپٹ نہ ہو اور انتشار کا شکار نہ ہو۔ موجودہ حالات میں مغرب جتنا طاقتور ہے اور مسلمان جتنے کمزور ہیں (اور یہ کمزوری صرف اسلحے اور سیاسی طاقت کی نہیں ایمان و اخلاق کی بھی ہے، تعلیم وتحقیق کی بھی ہے، معیشت و معاشرت کی بھی ہے) محض عوامی سطح پر جہاد کو (جس کے پردے پر اسلام دشمن یہود و ہنود و نصاریٰ کے سائے بھی لہرا رہے ہیں) مسلم امہ کے مستقبل کی تعمیر نو کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا۔ تاہم اگر کسی مسلم ملک پر دشمن حملہ کردے تو پھر دفاعی جہاد فرض بھی ہے اور مجبوری بھی؛ اور اس سے اعراض نہ صرف بے حمیتی ہے بلکہ غلامی قبول کرنے اور وجود ملی کا انہدام قبول کرنے کے مترادف ہے جس کی اسلام میں ہرگز کوئی گنجائش نہیں اور نہ کوئی زندہ اور غیرت والی قوم اسے برداشت کرسکتی ہے۔

عصر حاضر میں سیاسی شعبے میں اجتہاد —— ایک غلط فہمی کا ازالہ

اگرچہ مغربی جمہوریت اور اسلام کے امتزاج کو قبول کرنے والی 'اسلامی جمہوریت' اور نفاذِ شریعت بذریعہ جہاد کے جن دو نقطۂ نظر کو ہم غیر راجح اور نامناسب قرار دے رہے ہیں، اس کو رد کرنے کے بعد جب ہمارا تجویز کردہ پیراڈائم ابھرے گا اور اس کے تحت علماء کرام اور سکالرز جب عصر حاضر میں سیاسی شعبے کی اسلامی تشکیل نو کے لئے اجتہاد کرنے بیٹھیں گے تو وہ اپنی سیاسی ترجیحات خود وضع کرلیں گے اور اِس مرحلے میں غالباً یہ پیش از وقت (Premature) ہوگا کہ ہم اس کام کے رہنما خطوط وضع کرنے کی کوشش کریں لیکن اسلام کے سیاسی نظام کے بارے میں جو ایک عمومی غلط فہمی پائی جاتی ہے اس کا رد کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اسلام کا سیاسی نظام خلافت و امارت کی صورت میں ایک فرد میں ارتکاز اختیارات اور خلیفہ یا امیر المومنین کی آمریت کی حمایت کرتا ہے اور رائے عامہ یا جمہور مسلمین کے کردار کی اہمیت کو تسلیم نہیں کرتا۔ اور اگر مسلمان (قرآن و سنت میں سیاست کے صحیح پالیسی اصولوں کی موجودگی کے باوجود اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوۂ مبارکہ اور خلفائے راشدین کے بہترین عملی نمونے کی موجودگی کے علی الرغم) ماضی میں اپنے ہاں ایسا حقیقی شورائی سیاسی ڈھانچہ تشکیل نہیں دے سکے جس میں مسلمان عامتہ الناس کو حکمرانوں کے مقابلے میں سیاسی آزادی میسر ہوتی (اور یوں مسلمانوں کے ہاں مضبوط مرکز اور آمر نما مرکزی خلیفہ کا تصور بتدریج مستحکم ہوتا گیا—— اور بہت سے علماء و سکالرز آج بھی غلط فہمی سے بادشاہت وسلطنت اور آمریت کو اسلام کے سیاسی نظام کا صحیح مظہر سمجھتے ہیں یا حیلے بہانے اس کی حمایت کرتے ہیں) تو ہم باصرار کہتے ہیں کہ یہ روّیہ غلط ہے، یہ ہرگز اسلام کے صحیح سیاسی اصولوں کا مظہر نہیں اور نہ اسلام شخصی آمریت کو فروغ دینے کا حامی ہے۔

ہماری رائے میں مسلم ریاست میں (مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ میں) تقسیم اختیارات کا مسئلہ اجتہادی مسئلہ ہے۔ اگر تقویٰ کا معیار حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ جیسا ہو تو سربراہ ریاست کو زیادہ اختیارات دینے میں کوئی ہرج نہیں لیکن اگر تقویٰ کا معیار وہ نہ ہو تو اختیارات ایک فرد کی بجائے افراد یعنی اداروں میں تقسیم کر دینے میں کوئی ہرج نہیں اور نہ شریعت اس سے منع کرتی ہے۔ اور اگر کسی وجہ سے

ہم ماضی میں اسلام کے شورائیت، مساوات اور عدل کے تصورات کو اور مسلمان عوام کے بنیادی سیاسی حقوق، آزادی اظہار رائے اور حکومتوں کی تشکیل و خاتمے میں ان کے مؤثر کردار کو عملی شکل نہیں دے سکے تو یہ ہرگز ضروری نہیں کہ ہمارے علماء و سکالرز آج بھی ماضی کی روایت ہی پر عمل کریں بلکہ انہیں ذہنی بیداری، فکری حریت اور تخلیقی تحقیق کا ثبوت دینا چاہئے اور ایسے مستحکم سیاسی ڈھانچے کی تشکیل و قیام کے لیے اجتہادی تجاویز دینی چاہئیں جو شخصی آمریت کی نفی کریں اور جو مسلمان عامتہ الناس کو بنیادی سیاسی حقوق دیں جس میں انہیں اظہار رائے کی آزادی ہو، حکومتوں کی تشکیل و خاتمے میں ان کا مؤثر کردار ہو اور شخصی آمریت کے مقابلے میں ریاستی سطح پر تقسیم اختیارات اور اداروں کو مستحکم کرنے کے تصور پر عمل درآمد ہو۔

اگر ہمارے علماء و سکالرز اور مجتہدین ان خطوط پر اسلام کا سیاسی ڈھانچہ تجویز کریں تو ہمیں مغربی جمہوریت کی نقالی اور اس کے گن گانے کی ضرورت نہیں پڑے گی بلکہ اسلامی شورائیت میں ہمیں وہ ساری آزادیاں صحیح تناظر میں میسر ہوں گی جو آج کی مغربی جمہوریت میں غلط اور سیکولر تناظر میں ملتی ہیں۔ بلکہ ہم تو یہ تک کہنے کو تیار ہیں کہ جب ہمیں فکری استقلال میسر آجائے اور مغربی فکر و تہذیب کی غلامی، مرعوبیت اور اندھی نقالی سے ہماری جان چھوٹ جائے اور ہم اسلامی اصولوں کے تناظر میں چیزوں کو آزادانہ اور مجتہدانہ دیکھنے اور پرکھنے کے اہل ہو جائیں تو پھر مغرب کے سیاسی اداروں کے مطالعے اور ان سے محتاط استفادے میں بھی کوئی حرج نہیں کہ بہرحال وہ انسانی تجربہ تو ہیں۔ اگر فوکو یاما کی طرح انہیں End of the History and the Last Man یعنی فکر انسانی کی بلندی کی انتہا اور معیار حق و باطل نہ سمجھا جائے اور محض انسانی تجربات سمجھا جائے اور ان سے مرعوب و متاثر ہو کر ان کی اندھی نقالی نہ شروع کر دی جائے تو محتاط انداز میں اہل مغرب کے اداروں کا تجزیہ کرنے اور ان سے محتاط استفادہ کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ کوئی تہذیب بھی ہوا بند خانوں میں پروان نہیں چڑھتی بلکہ دوسروں سے اخذ و استفادہ بھی کرتی ہے اور اپنے سے پہلے کی تہذیبی پیش رفت کی اساس پر ہی آگے بڑھتی ہے جیسے حضرت عمرؓ نے اہل فارس کے نظام دیوان کو قبول کر لیا تھا یا مفتوحہ علاقوں کے نظام اراضی کو علی حالہ قائم رہنے دیا تھا۔

حاصل بحث

اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ مغربی جمہوریت جس نظریہ حیات اور ورلڈویو کی پیداوار ہے وہ سراسر غیر اسلامی ہے لہٰذا مغربی جمہوریت اور اس کا سارا ڈھانچہ خلاف اسلام ہے اور اس میں چند سطحی اور برائے نام اسلامی تبدیلیوں سے وہ "اسلامی جمہوریت" نہیں بن جاتی اور نہ وہ 'خلافت' یا اسلام کے مطلوبہ سیاسی نظام کی جگہ لے سکتی ہے۔ اس حوالے سے صحیح طریقہ یہ ہے کہ نیا سیاسی نظام خالص اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مدوّن کیا جائے اور مغربی تہذیب کے غیر اسلامی اصولوں کو رد کر دیا جائے البتہ عصری تقاضوں کو پیش نظر رکھا جائے۔لیکن بے دین مسلم حکمران، بیوروکریٹ اور دانشور چونکہ اس میں رکاوٹ ہیں اور انہیں یورپ اور امریکہ کی مکمل پشت پناہی حاصل ہے جو کسی قیمت پر اسلام کے نفاذ اور اسلامی قوتوں کو برسراقتدار دیکھنا نہیں چاہتے اور اپنی فکر وتہذیب خصوصاً سیکولر جمہوریت کو پوری قوت سے مسلم معاشرے پر مسلط ہیں لہٰذا متبادل حکمت عملی یہی ہوسکتی ہے کہ مسلم فرد میں تبدیلی لائی جائے اور ایسی تعلیم وتربیت اور میڈیا پالیسی کے ذریعے جس کی بنیاد اسلام سے وابستگی اور مغربی فکر وتہذیب کے رَد پر ہو، بتدریج مسلم معاشرے میں انسان سازی کے ذریعے ماحول ومعاشرے کو تبدیل کر دیا جائے اس سے جو افرادی قوت اور ہیومن انرجی پیدا ہوگی اسے سیاسی سطح پر کارفرما ہونے سے کوئی طاقت نہیں روک سکے گی۔یہی اس مسئلے کا فطری اور منطقی حل ہے۔

تزکیۂ نفس **احمد جاوید**

تہجد کی عادت کیسے ڈالیں؟

س: ایک آدمی تہجد پڑھنا چاہتا ہے مگر اسے اپنی اس خواہش پر عمل کرنا بہت دشوار معلوم ہوتا ہے۔ ایسے شخص کو آپ کیا مشورہ دیں گے؟

ج: حدیث میں آیا ہے کہ فرض نمازوں کے بعد افضل نماز تہجد ہے۔اسے عام نوافل پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔تہجد نہ پڑھنے والا نہ صرف یہ کہ ایک بڑی سعادت سے محروم ہے بلکہ اس نے ذوق عبادت کی نشوونما کا راستہ بھی اپنے اوپر بند کرلیا ہے۔تہجد کی عادت ڈالے بغیر ایک تو نماز میں مجموعی بہتری تقریباً ناممکن ہے دوسرے نفس پر اس گرفت کا حصول بھی بہت دشوار ہے جو تزکیے میں درکار رہوتی

ہے۔ اس نماز کی برکت سے آدمی اپنے نفس پر غالب آنے اور رہنے کی قوت حاصل کر لیتا ہے۔کون نہیں جانتا کہ یہ قوت پوری بندگی کا خلاصہ ہے اور اس کے بغیر عبودیت مستقلاً ناقص ہے۔ اتنے عظیم الشان عمل کے لئے کوشش نہ کرنا سخت ناسمجھی کی بات ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعض لوگ تہجد کی خواہش رکھتے ہیں اور چند بار اس کی ادائی کی کوشش بھی کر لیتے ہیں لیکن ہمارے خیال میں اتنا کافی نہیں ہے۔ اس نماز کو باقاعدہ ایک ہدف بنانا چاہیے اور اس کے لئے بہت ٹھوس کوشش کرنی چاہیے اور چند مرتبہ کی ناکامی سے ہمت ہار دینے کی بجائے اس کوشش کو شوق اور مستقل مزاجی کے ساتھ جاری رکھنا چاہیے۔ اس حالت میں اگر خدانخواستہ تہجد کا معمول زندگی بھر میسر نہ آئے تو بھی قوی امید ہے کہ یہ شخص اللہ کے فضل سے تہجد گزاروں میں شمار کیا جائے گا۔

ہمارے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ دینی مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے اپنے معمولات میں جو تبدیلیاں ناگزیر ہیں ہم ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ یہی سبب ہے کہ ہماری اکثر دینی آرزوئیں پوری ہونے سے رہ جاتی ہیں۔ یہ بات اچھی طرح یاد رکھنے کی ہے کہ دین مسلسل تبدیلیوں کا تقاضا کرتا ہے اور اپنے اوپر کسی چیز کو ترجیح دینے کے رویے کو برداشت نہیں کرتا۔ تہجد کا معاملہ یہ ہے کہ ہمارے موجودہ معمولات زندگی اس قدر خراب ہو گئے ہیں کہ ہم کسی مجاہدے والے کام کو انجام دینے کی ہمت نہیں کرتے۔ تہجد کے لئے جس وقت اٹھنا مسنون ہے اس وقت تو ہم سونے کے لئے لیٹتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں ہمارا وہ مزاج ہی نہیں بن پاتا جو عبادات کی طرف رغبت رکھتا ہے۔ جو حضرات تہجد کی خواہش میں سچے ہیں انہیں سب سے پہلے اپنے موجودہ معمولاتِ زندگی کو بدلنا چاہیے اور اس کے ساتھ ساتھ عبادت کا ذوق وشوق پیدا کرنے یا اسے بڑھانے کی شدید کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ ان دو چیزوں کے بغیر تہجد کی سعادت ہاتھ نہیں آ سکتی۔

ایک اور اصولی بات ہے جو صرف اس مسئلے تک محدود نہیں ہے بلکہ دینداری کی پوری عمارت اسی بنیاد پر کھڑی ہے وہ ہے اتباع رسول اللہ ﷺ کا جذبہ۔ رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ مبارکہ کا رنگ پوری طرح قبول کئے بغیر دین کا کوئی جز بھی ہمارے اندر مکمل نہیں ہو سکتا۔ ہم اگر آپ ﷺ کے مزاج اور طبیعت کو اپنی شخصیت کی تشکیل کا جوہر بنا لیں تو پھر دین کے ساتھ ہماری وابستگی درجۂ کمال کو پہنچ کر رہے گی اور ایک تہجد ہی پر کیا منحصر ہے پورا دین ہمارے لئے خوشگوار اور آسان ہو جائے

گا۔ اس معاملے میں علمی اور فنی بحثوں میں نہیں پڑنا چاہیے۔ سادہ طریقے سے رسول اکرم ﷺ کو کمالات بشریت کا مکمل ترین نمونہ سمجھ کر آپ ﷺ کی ان زاویوں سے بھی اتباع کرنی چاہیے جن کا تعلق بظاہر انسانی شخصیت کے عمومی لوازم سے ہے۔ بہت زیادہ قانونی ذہن دین کے لئے مضر ہے کیونکہ وہ اس بات کی اہمیت کو نہیں سمجھتا کہ رسول اکرم ﷺ کو مثالی شخصیت مانے بغیر اور اس کی ایسی اتباع کئے بغیر جس سے ہمارا مزاج اور نفسیات اس نمونے کے تابع ہو جائے، مسلمان بننا ایک بے معنی بات ہے۔ رسول اللہ ﷺ صرف ہادی اور رسول کی حیثیت سے محبوب نہیں ہیں بلکہ اپنی پوری شخصیت کے ساتھ محبوب ہیں۔ یعنی آپ ﷺ کا پیغام بھی محبوب ہے اور آپ ﷺ کی ذات بھی محبوب ہے۔ ہماری نظر میں اتباع کا ہر وہ مفہوم ناقص ہے جس میں آپ ﷺ کے مزاج اور عادات کو شامل نہ کیا جائے۔ اسی لئے ہمارا اصرار ہے کہ اس پہلو سے اتباع رسول اللہ ﷺ میں آگے بڑھنے کی کوشش کی جائے ورنہ دین کا بیشتر حصہ رفتہ رفتہ غیر مرغوب اور ناقابل عمل ہوتا چلا جائے گا۔ یہ نحوستیں ہم اس زمانے میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

مختصر یہ کہ تہجد کی ادائی میں کامیابی کے لئے مندرجہ ذیل امور پر عمل پیرا ہونا پڑے گا:

۱۔ نبی کریم ﷺ کے مزاج مبارک کی اتباع

۲۔ باجماعت نماز کا مستقل اہتمام

۳۔ رات کو جلدی سونا

۴۔ سوتے وقت خاص طور پر وضو کرنا اور لیٹ کر اللہ سے یہ دعا کرنا کہ تہجد میں اٹھنا سہل ہو جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ الارم لگانا بھی ضروری ہے یا کسی سے درخواست کرنا کہ مجھے فلاں وقت اٹھا دیا جائے۔

۵۔ آپ ﷺ کے معمول کے مطابق ہفتے میں دو دن جمعرات اور پیر کے روزے کا اہتمام کرنا۔

ان تدابیر پر عمل کرنے سے ان شاء اللہ زیادہ سے زیادہ تین ماہ میں تہجد کی عادت پڑ جائے گی۔

ان تمام کوششوں کے باوجود اگر خدانخواستہ کامیابی میں دیر لگ رہی ہو تو سونے سے پہلے تہجد پڑھی جا سکتی ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ وتر کو عشاء کے ساتھ نہ ملایا جائے اور گھر آ کر سونے سے آدھ پون گھنٹہ پہلے چار چھ نوافل اور وتر تہجد کی نیت سے ادا کر لئے جائیں۔ یہ بات حدیث سے بھی ثابت ہے۔

س: آپ نے معمولات کی تبدیلی اور عبادات کے ذوق وشوق کو تہجد کے لئے ضروری قرار دیا ہے۔ تبدیلیٔ معمولات کی وضاحت تو ہو گئی لیکن یہ بات ابھی وضاحت کی محتاج ہے کہ عبادات کا ذوق و شوق کیا ہوتا ہے اور اسے پیدا کرنے یا بڑھانے کے لئے کون سی چیزیں ضروری اور مفید ہیں؟

ج: مختصراً ذوق کا تعلق احسان سے ہے اور شوق کا رغبت سے۔ احسان اور رغبت عبادات کے لئے روح اور جوہر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ عام زبان میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ عبادات میں دل لگنا ذوق ہے اور معیار یا مقدار کے اعتبار سے مزید آگے جانے کی خواہش شوق ہے۔ اصل میں اوپر ہم نے اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک خاص تقاضے کا ذکر کر کے اپنی دانست میں وہ تدبیر عرض کر دی تھی جو اس ذوق وشوق کی پیدائش اور افزائش کا واحد سبب ہے۔ اس پر غور فرمائیں، ان شاء اللہ ساری بات کھل جائے گی۔ ویسے چند عمومی تدابیر جو اس معاملے میں معاون ہو سکتی ہیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ گناہ سے بچنا اور ہر مرتبہ کسی گناہ سے بچنے کے بعد اللہ کا شکر ادا کرنا۔

۲۔ غفلت سے باز رہنا یعنی اللہ کو ہر حال میں یاد رکھنا اور یاد کرنا۔

۳۔ نماز اور قرآن کے ساتھ تعلق میں بہتری کی جو تدابیر بتائی جا چکی ہیں ان پر مستقل مزاجی سے کار بند رہنا۔

۴۔ مسجد سے تعلق کو مضبوط بنانا اور مسجد کی صفائی وغیرہ میں حصہ لینا۔

۵۔ اپنی تنہائی کو اللہ کی یاد کے لئے مخصوص کر لینا۔

۶۔ استغفار اور تسبیح میں اس طرح مشغول رہنا کہ دماغ میں اس کا مفہوم حاضر ہو اور دل میں اس کی کیفیت۔ رفتہ رفتہ اس طریقے کو نماز اور تلاوت میں بھی جاری کرنا چاہیے۔

س: نوافل کے باب میں آپ نے صرف تہجد پر زور دیا، کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ نوافل کے فضائل پر کچھ گفتگو کر لی جائے تاکہ ہمیں یہ پتہ چل سکے کہ نفلی عبادات خصوصاً نماز کا تزکیۂ نفس اور باطنی ترقی میں کیا کردار ہے؟

ج: بہت اچھا سوال ہے۔ اصل میں تہجد کی حیثیت محض نفل سے زیادہ ہے اس لئے ہم نے اس پر زور دیا ہے۔ جہاں تک نفل نمازوں کا تعلق ہے ان کی طرف رغبت اور میلان کے بغیر فرض نمازوں سے بھی وہ قلبی اور روحانی نسبت میسر نہیں آ سکتی جو دین کو مطلوب ہے۔ قدرے بے تکلفی سے کہا جائے تو

یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ نوافل کو ترک کرنے والا رویہ قانونی سطح پر قابل گرفت نہ ہونے کے باوجود نماز کی ناقدری پر دلالت کرتا ہے۔ اس رویے سے واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ اس شخص میں ذوق عبادت کی شدید کمی ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ نماز سے حقیقی مناسبت رکھنے والی طبیعت نوافل سے دور رہنا گوارا کرسکتی ہے۔ آخر کوئی وجہ تو ہوگی کہ آپ ﷺ نے اکثر نفل نمازوں پر مداومت فرمائی ہے۔ یہاں ہم تفصیل میں جائے بغیر نفل نہ پڑھنے کے نقصانات کی ایک فہرست بنا کر پیش کررہے ہیں اس سے ان شاء اللہ نوافل کی حقیقی اہمیت کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے:

۱۔ ذوق عبادت سے محرومی

۲۔ شوق ذکر کا فقدان

۳۔ اتباع رسول اللہ ﷺ کے جذبے سے محرومی

۴۔ حصول احسان کی تمنا سے بے خبری

۵۔ اللہ کے خوف اور محبت سے لاتعلقی

ان میں سے ہر ایک نقصان بہت بنیادی نوعیت کا ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ ان نقصانات سے بچنے کا کوئی قابل اعتبار طریقہ نوافل کو نظر انداز کر کے ممکن ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ آدمی کی نفسیاتی بناوٹ اللہ کے مخلص اور سچے بندے کی ہو اور وہ ترک نوافل کو اپنی عادت بنا لے یا اس کے اندر نفل نمازوں کا شوق اور اہتمام نہ ہو۔

پاکستانیات

ڈاکٹر محمد امین

☆ روایتی علماء کرام کو مولانا سے اختلاف اس بات سے زیادہ ان دلائل کی تفصیلات میں تھا جن سے انہوں نے اپنا نظریہ ثابت کرنے کی کوشش کی اور ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم کو (جنہوں نے جماعت سے الگ ہوکر 'تنظیم اسلامی' بنائی) اور نعیم صدیقی مرحوم کو (جنہوں نے 'تحریک اسلامی' قائم کی) مولانا کی بنیادی فکر خصوصاً اقامت دین سے اختلاف نہ تھا بلکہ ان کا جماعت سے اختلاف اس کے طریق کار خصوصاً اس کے انتخابی سیاست میں حصہ لینے اور انہماک سے تھا۔

پاکستان میں نفاذ شریعت کی متبادل حکمت عملی

سید مودودیؒ کے حلقۂ فکر کی خدمت میں چند گزارشات

[ہمارا معاشرہ جس بُری طرح اخلاقی انحطاط کا شکار ہے، دین سے دور ہو رہا ہے اور جس شدت سے مغرب کی ملحدانہ فکر وتہذیب اور اس کی اقدار پاکستانی معاشرے میں غالب آ رہی ہیں وہ پاکستان کی دینی قوتوں کے لیے سنجیدہ غور وفکر کا موضوع ہونا چاہیے۔ ہمارے تجزیے کی رو سے اس کی ایک بڑی وجہ مغربی فکر وتہذیب کے ساتھ مفاہمتی رویہ اختیار کرنا اور اس کے اداروں میں اسلامی لحاظ سے معمولی کتر بیونت کے بعد انہیں اسلامی قرار دے لینا ہے۔ اس کا ایک مظہر ہمارا سیاسی نظام ہے جس میں دینی سیاسی قوتیں کامیاب نہیں ہو سکیں بلکہ انہیں کامیاب نہیں ہونے دیا گیا۔ دینی قوتوں کو اس سنگینی کی طرف متوجہ کرنے کے لیے ہم نے البرہان میں ایک سلسلہ مضامین شروع کیا ہے۔ چنانچہ ستمبر کے شمارے میں ہم نے ان علماء کرام کو ''دینی جدوجہد کے لیے نئی حکمت عملی کی ضرورت ۔ علماء کرام اور دینی عناصر کی خدمت میں چند گزارشات'' کے عنوان کے تحت مخاطب کیا جو دینی مدارس اور دعوتی کاموں میں مصروف ہیں اور گویا غیر سیاسی شعبے میں کام کر رہے ہیں۔ نومبر کے شمارے میں ہم نے ''پاکستان کی دینی سیاسی جماعتیں ۔ ناکامی کے اسباب اور کامیابی کا لائحہ عمل'' کے عنوان سے پاکستان کی دینی سیاسی جماعتوں کو مخاطب کر کے انہیں اصلاحی اقدامات کی طرف توجہ دلائی۔ آج کی اس نشست میں ہم جماعت اسلامی پاکستان کی سیاسی وفکری قیادت کے سامنے کچھ اصلاحی معروضات پیش کرنا چاہتے ہیں۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہم پاکستان کی دینی قوتوں سے محبت رکھتے ہیں اور انہیں کامیاب ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں لہٰذا محبت و احترام سے انہیں ایسے امور کی طرف متوجہ کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے جن سے وہ اپنے اس مشن میں کامیاب ہو سکیں اور پاکستانی معاشرہ سچ مچ ایک صحیح اسلامی معاشرہ بن جائے۔ ہم آئندہ دوسری دینی جماعتوں اور تحریکوں کی خدمت میں بھی اسی طرح محبت اور خیر خواہی سے کچھ گزارشات پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ جماعت کی مدبر، جہاندیدہ اور بیدار فکر قیادت ہماری گزارشات پر سنجیدگی سے غور کرے گی اور ان جذباتی کارکنوں کے نعروں میں نہیں آئے گی جو یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان اسلامی انقلاب کی دہلیز پر کھڑا ہے اور وہ جلد عوامی انقلاب برپا کر دیں گے یا انتخابات میں ساری قوتوں کو ہرا کر اسلام کا جھنڈا پاکستان پر لہرا دیں گے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ٹھنڈے دل ودماغ سے معاملات کو گہرائی میں جا کر دیکھا جائے اور حالات کا بے لاگ تجزیہ کر کے انہیں سمجھنے کی کوشش کی جائے اور اپنا احتساب بے دردی سے کیا جائے کہ اسی

سے کامیابی کی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔

اس مضمون کے ساتھ اگر 'اسلام اور مغرب کے ذیل میں چھپنے والے دو مضامین ('مغربی فکر کے ساتھ مفاہمتی پالیسی کی ناکامی اور نئی اجتہادی اپروچ کی ضرورت' اور 'مغربی جمہوریت کو اسلامی جمہوریت بنانے اک تجربہ اور اس کے نتائج') بھی قارئین مطالعہ فرمالیں تو امید ہے معاملہ مزید نکھر کر ان کے سامنے آجائے گا، ان شاء اللہ۔ امین]

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نہ صرف برصغیر پاک و ہند بلکہ عالم اسلام کے معروف مفکر اور دینی قائد ہیں۔ آپ کی فکر کا امتیازی پہلو 'نظریۂ اقامت دین' ہے جسے عملاً برپا کرنے کے لیے آپ نے ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی۔ 'اقامت دین' کا سادہ اور عام فہم مفہوم یہ ہے کہ دین ہم مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں بھی غالب و نافذ ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے اپنے عموم میں یہ بات اختلافی نہیں ہے☆ کہ مسلمانوں کو نہ صرف اپنی انفرادی زندگی میں دین کے احکام پر عمل کرنا چاہیے بلکہ ان کی اجتماعی اور ریاستی زندگی میں بھی دین نافذ و غالب ہونا چاہیے اور ریاستی قوت کو صحیح اسلامی معاشرہ قائم کرنے میں صرف ہونا چاہیے۔ جماعت اسلامی نے اس غرض سے پاکستان میں جو سیاسی جدوجہد کی ہے وہ تاریخ کا ایک حصہ ہے اور جماعت اسلامی سے اختلاف رکھنے والے انصاف پسند لوگ بھی اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ اس وقت پاکستان کے آئین، قوانین اور بحیثیت مجموعی پورے سیاسی و معاشرتی کلچر میں جتنا اسلام موجود ہے اس میں جماعت اسلامی کی جدوجہد کا حصہ وافر ہے تاہم اس کے باوجود یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جماعت اسلامی (اور دیگر دینی سیاسی قوتیں) اسلامی حوالے سے پاکستان میں بہت کچھ حاصل نہیں بھی کرسکیں بلکہ اب تو ریاست کی گاڑی سیکولرزم اور مغربیت کی لادین راہوں پر چل نکلی ہے اور پاکستانی معاشرہ بڑی تیزی سے تعلیم، میڈیا اور معاشی و سماجی اقدار کے حوالے سے مغربیت قبول کرتا چلا جارہا ہے لیکن جماعت اسلامی (اور دیگر دینی سیاسی قوتیں) اس امید پر اپنی جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہیں کہ وہ مستقبل میں ان شاء اللہ مزید اسلامی مقاصد حاصل کرسکیں گی اور پاکستان کو لادینیت کی راہوں پر چلنے نہیں دیں گی۔

جب دینی سیاسی جماعتیں اور خصوصاً جماعت اسلامی مستقبل کے لیے پُرامید ہے اور اپنی جدوجہد موجودہ صورت ہی میں جاری رکھنا چاہتی ہے تو بلاشبہ اسے اس کا حق حاصل ہے اور اس کام کی ضرورت، افادیت اور اہمیت سے بھی انکار ممکن نہیں لیکن جو وہ حاصل نہیں کرسکی اور جو کچھ مغرب کی ملحدانہ تہذیب کے سیلاب میں حاصل ہوتا ہوا نظر نہیں آرہا بلکہ بہت کچھ جاتا ہوا نظر آرہا ہے تو اس کے بارے میں ایک

لحظہ ٹھہر کر، ٹھنڈے دل و دماغ سے یہ تجزیہ کرنے اور سوچنے میں آخر کیا حرج ہے کہ ہم پاکستان میں بعض بڑے اسلامی مقاصد جو حاصل نہیں کر سکے تو کیا اس کے لیے کوئی متبادل حکمت عملی ممکن ہے؟ خوش قسمتی سے مولانا مودودی کی فکر میں اس کا واضح مثبت جواب موجود ہے اس لیے ہم نے مناسب سمجھا کہ ان سے عقیدت رکھنے والوں کے سامنے مولانا کا وہ مؤقف بطور تذکیر پیش کر دیا جائے۔

پاکستان میں نفاذ اسلام کی حکمت عملی

قیام پاکستان کے بعد جب مولانا مودودیؒ اور ان کی جماعت پاکستان منتقل ہوگئی اور یہاں دینی کام جاری رکھنا چاہا تو اب حالات میں ایک بنیادی تبدیلی آ چکی تھی اور وہ یہ کہ اب پاکستان ایک آزاد مسلم مملکت بن چکا تھا اور اس دعوے پر بنا تھا کہ یہ اسلام کی تجربہ گاہ بلکہ اس کا قلعہ ہوگا۔ ان حالات میں جب مولانا کے سامنے یہ سوال آیا کہ پاکستان میں اقامت دین کے لیے جماعت اسلامی کی حکمت عملی کیا ہونی چاہیے تو انہوں نے ترجمان القرآن میں اس موضوع پر لکھا (بحث اب ان کی کتاب 'اسلامی ریاست' کے آخری صفحات میں موجود ہے) کہ اس کے دو طریقے ممکن ہیں، ایک سیاسی جدوجہد کے ذریعے اقتدار میں آ کر اور دوسرے اصلاح معاشرہ کے ذریعے یعنی مسلم عوام کی فکری اور عملی اصلاح کا بنیادی کام کر کے جس کے نتیجے میں منطقی اور طبعی طور پر اسلامی انقلاب کی پُو پھوٹنا شروع ہو جاتی ہے۔ یہی بات مولانا نے ۱۹۴۱ء میں علی گڑھ میں اپنی اس تقریر میں زور دے کر کہی تھی جو 'اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟' کے عنوان سے پمفلٹ کی صورت میں برسوں سے چھپتی آ رہی ہے۔ مولانا نے ترجمان میں لکھا کہ اس وقت ہم پہلے طریقے سے پاکستان میں اسلامی انقلاب لانے کی کوششیں کریں گے کہ تحریک پاکستان کے نتیجے میں ایسی فضا بن چکی ہے کہ سیاسی جدوجہد سے مطلوبہ تبدیلی کا امکان موجود ہے لیکن اگر خدانخواستہ ہمیں اس میں کامیابی نہ ملی تو ہم تبدیلی بذریعہ اصلاح معاشرہ کے منہاج کی طرف واپس لوٹ جائیں گے۔

مولانا کی یہ تحریر اوائل ۱۹۴۸ء کی ہے اور جماعت کی ۶۳ سالہ جدوجہد کے نتیجے میں نہ تو جماعت کو اقتدار ملا ہے اور نہ بظاہر اس کے زیادہ امکانات مستقبل قریب میں نظر آتے ہیں اور پاکستان کے سیاسی ڈھانچے کی اسلامائیزیشن میں جو جزوی کامیابی اسے دوسری دینی قوتوں کے ساتھ مل کر جدوجہد کے نتیجے میں ملی ہے (جیسے آئین میں اسلامی دفعات کا شمول، حدود قوانین، اسلامی نظریاتی کونسل، شریعت کورٹ کا قیام۔۔۔وغیرہ) تو وہ بھی حکمرانوں کے عدم اخلاص اور ان پر مؤثر عمل درآمد کی نیت اور عزم نہ رکھنے کی وجہ سے غیر مؤثر ہوگئی ہے بلکہ مغربی تہذیب کی بڑھتی ہوئی لادینی یلغار نے

معاشرے کا رُخ مغربیت کی طرف موڑ دیا ہے اور پاکستان کا اسلامی مستقبل بعض اوقات مخدوش لگنے لگتا ہے۔

ان حالات میں ٹھنڈے دل سے اور سنجیدگی سے یہ سوچنے کی ضرورت ہے کہ کیا وہ وقت نہیں آ گیا کہ سید مودودیؒ کے اس کہے پر عمل کیا جائے کہ اگر ہمیں 'اسلامی انقلاب بذریعہ سیاسی جدوجہد' میں کامیابی نہ ملی تو ہم 'اسلامی انقلاب بذریعہ اصلاح معاشرہ' کی حکمت عملی کی طرف لوٹ جائیں گے۔ راقم کا تجزیہ یہ ہے کہ وہ وقت آ گیا ہے اور جماعت کے اصحاب فکر کو اس پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

اس بنیادی بات کے علاوہ بھی کچھ اور پہلو ایسے ہیں جو جماعت اسلامی سے اپنی حکمت عملی پر نظر ثانی کا تقاضا کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض اہم نکات کی طرف ہم یہاں اشارہ کیے دیتے ہیں:

نفاذ اسلام بذریعہ اسلامی قوانین

جماعت ماضی میں اس بات پر بہت زور دیتی رہی ہے کہ پاکستان میں اسلامی قوانین نافذ کیے جائیں بلکہ جماعت اور دیگر دینی حلقوں میں اس بات کو نفاذ شریعت کا بنیادی ذریعہ بلکہ اس کے مساوی سمجھا جاتا رہا ہے کہ نفاذ شریعت کا مطلب ہے اسلامی قوانین کا اجراء۔ چنانچہ ہمیں یاد ہے کہ ۱۹۷۹ء میں جب مرحوم ضیاء الحق نے اسلامی حدود کا اجراء کیا تو لوگوں نے مولانا مودودیؒ کو جا کر مبارکباد دی کہ پاکستان میں اسلامی قوانین جاری ہوگئے ہیں اور شریعت نافذ ہوگئی ہے جو ان کا عمر بھر کا مطالبہ اور خواہش رہی ہے۔ لیکن آج جب حدود قوانین کے پاکستان میں نفاذ کو ۳۲ سال گزر چکے ہیں اور کسی ایک حد پر بھی عمل نہیں کیا گیا اور نہ پاکستانی معاشرے پر اس کے مثبت اور خوشگوار اثرات مرتب ہوئے ہیں بلکہ حالات معاشی، معاشرتی عدل و انصاف اور امن و امان کے حوالے سے پہلے سے بدتر ہو چکے ہیں تو یہ بات نمایاں ہو کر سامنے آ جاتی ہے کہ محض کاغذوں میں اسلامی قوانین کا اجراء کوئی معنویت اور اہمیت نہیں رکھتا۔ اس سے نہ ملک میں عملاً شریعت نافذ ہوئی ہے اور نہ ان قوانین کی کوئی افادیت ہے سوائے ایک نظری کامیابی کے احساس کے کہ پاکستان میں اسلامی احکام اب ملک کے مجموعۂ قوانین کا ایک حصہ ہیں۔

حدود قوانین اور دوسرے اسلامی قوانین پر عمل درآمد نہ ہونے اور ان کے نتیجہ خیز نہ ہونے نے ایک دو مزید اصولوں کی تنقیح اور تصحیح کردی ہے۔ ایک تو یہ کہ اسلامی نظام زندگی اور نفاذ شریعت کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے حکومتی قوت سے اوپر سے لوگوں پر تھونپا جاسکے بلکہ اس کی بنیاد فرد کی تبدیلی ہے۔ اس کے دل و دماغ کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ جب تک لوگ خود اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی

میں اسلامی احکام پر عمل نہ کرنا چاہیں اور یہ ان کی اپنی خواہش نہ بن جائے اس وقت تک محض حکومت کے کہنے سے یا قوانین بنادینے سے وہ مؤثر طور پر اسلامی احکام پر عمل نہیں کرتے لہٰذا فرد اور معاشرے کی اصلاح ایک بنیادی ضرورت اور تقاضا ہے جس سے مفر ممکن نہیں۔

ریاست کے کردار میں تبدیلی

ایک اور بنیادی اصول جس پر نفاذ شریعت کے حوالے سے جماعت (اور دیگر دینی سیاسی جماعتیں) عمل بلکہ اس پر انحصار کرتی رہی ہیں وہ نفاذ شریعت میں ریاست کا کردار ہے۔ شاید کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب جماعت کے لوگوں کی طرف سے حکومت سے یہ مطالبہ سامنے نہ آیا ہو کہ حکومت پاکستان ملک میں اسلامی نظام نافذ کرے۔ لیکن یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ہمارے دیکھتے پچھلی چند دہائیوں میں ریاست کے کردار میں ایک تبدیلی آئی ہے اور وہ یہ کہ ریاست کے اقتدار کا پنجہ کچھ ڈھیلا ہوا ہے اور اقتدار کی نچلی سطحوں تک منتقلی (Devolution of Power) کے تصور کے تحت امور ریاست کے ہاتھ سے نکال کر عوام اور نچلی سطح کے عوامی اداروں کے ہاتھ میں آگئے ہیں۔ این جی اوز، پرائیویٹ سیکٹر کی حوصلہ افزائی، بلدیاتی اداروں کو مزید اختیارات دینا، پرائیویٹ پبلک پارٹنرشپ، سول سوسائٹی کی ترقی وغیرہ سب اسی کا مظہر ہیں۔

اس بات کو ہلکا نہ سمجھیے اور اس کے نتائج پر غور کیجیے۔ آپ پہلے حکومت سے مطالبہ کرتے تھے کہ نظام تعلیم کو اسلامی بناؤ۔ اب تعلیم پرائیویٹ سیکٹر کے پاس ہے۔ آپ حکومت سے مطالبہ کرتے تھے کہ سودی نظام ختم کرو، اب آپ خود غیر سودی بنک بنا سکتے ہیں۔ آپ حکومت سے مطالبہ کرتے تھے کہ الیکٹرانک میڈیا سے فحاشی اور حکومتی جبر ختم کرو۔ اب آپ اپنا ٹی وی چینل کھول سکتے ہیں۔ غرض آپ اپنے آپ کو اور عوام کو منظم کرکے زندگی کے جس میدان میں جو چاہیں کر سکتے ہیں اور یہ سب آئین اور قانون کے دائرے کے اندر ہوگا۔

خلاصہ اس نکتے کا یہ ہے کہ اب یہ نعرہ کہ حکومت اسلامی نظام یا شریعت نافذ کرے، اپنا وزن کھو چکا ہے اور آپ خود کو منظم کرکے اور عوام کی حمایت سے ایسے بہت سے اقدامات حکومتی مدد کے بغیر بھی کر سکتے ہیں جن سے آدھی سے زیادہ شریعت نافذ ہوجائے گی۔ لہٰذا جو بات آپ کے بس میں ہے وہ تو کیجیے اور حکومت سے بھی مطالبہ کرتے رہیے کہ وہ نفاذ شریعت کا فرض پورا کرے لیکن آپ اس ضمن میں خود جو کر سکتے ہیں وہ کیوں نہیں کرتے؟ جماعت کے لوگوں کے پاس ہزاروں تعلیمی

ادارے ہیں ان میں اسلامی نظام تعلیم آپ کیوں نافذ نہیں کرتے؟ آپ اپنا ٹی وی چینل کیوں نہیں کھولتے۔ اپنا اسلامی بنک کیوں نہیں بناتے؟۔۔۔۔۔وغیر ذلک۔

خدمت خلق شرعی تقاضا ہے

معاشرے کی اصلاح کا ایک پہلو اور اس کا ایک بنیادی تقاضا یہ ہے کہ مسلمانوں کے دکھ درد دور کیے جائیں، مصیبتوں اور مشکلات میں ان کی مدد کی جائے اور یہ سیاسی حکمت عملی نہیں شرعی تقاضا ہے۔ آپ کا ہمسایہ بھوکا ہے تو اس کو کھانا کھلانا ایک شرعی تقاضا ہے۔ ایک مسلمان بھائی سیلاب میں ڈوب رہا ہے تو اس کو بچانا ایک شرعی تقاضا ہے بلکہ یہ تو انسانی تقاضا ہے اور ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبوت سے پہلے بھی اس طرح کے کارہائے خیر میں پیش پیش رہا کرتے تھے۔

اسی طرح یہ بھی فطری ہے کہ جو لوگوں کے دکھ درد دور کرتا ہے لوگ اس سے محبت کرتے اور اس کا احترام کرنے لگتے ہیں۔ اسی لیے یہ محاورہ بنا ہے کہ 'ھر کہ خدمت کرد او مخدوم شد' لہٰذا یہ تصور غلط ہے کہ آپ اقتدار میں آنے کا انتظار کریں کہ آپ کی حکومت آئے گی تو آپ لوگوں کی خدمت کریں گے بلکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ آپ آج لوگوں کی خدمت کریں لوگ کل خود آپ کو اقتدار میں لے آئیں گے اور لوگوں کے دکھ درد اور ان کی مشکلات دور کرنے کا یہ کام ایک شرعی تقاضا سمجھ کر کیا جانا چاہیے۔

عمل کی دنیا میں اس کے نتائج دیکھیے۔ مسلم روایت میں صوفیائے کرام نے یہ کام کیا تو وہ مرجع خلائق بن گئے اور اسلام کی جتنی اشاعت ان کے ہاتھوں سے ہوئی، معاف کیجیے گا، علماء و فقہاء و محدثین کے ہاتھوں سے نہیں ہوئی۔ عصر حاضر میں دیکھیے تو الجزائر میں اسلامی تحریک نے عوامی بلدیاتی سطح پر یہ کام کیا تو عوام نے قومی سطح پر ان کو کامیاب کرایا۔ ترکی کی اسلامی تحریک نے عوامی اور بلدیاتی سطح پر یہ کام کیا تو عوام نے انہیں قومی سطح پر ووٹ دے کر کامیاب کیا۔ خود جماعت اسلامی کے ایک فرد ڈاکٹر نذیر احمد شہید نے یہ اسلوب اپنایا تو لوگ ان کے علاوہ کسی کو ووٹ نہیں دیتے تھے۔

اس نکتے کا خلاصہ یہ ہے کہ معاشرے کی اصلاح کے ساتھ لوگوں کے دکھ درد اور مصائب دور کرنا اور خدمت خلق جماعت کی بنیادی حکمت عملی کا ایک اہم حصہ ہونا چاہیے۔

اس وقت تک ہم نے جو عرض کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ 'اسلامی نظام زندگی بذریعہ اصلاح معاشرہ' جیسا کہ مولانا مودودیؒ نے فرمایا 'اسلامی نظام زندگی بذریعہ سیاسی جدوجہد' کے متوازی ایک

☆ ہم ان شعبوں میں مطلوب کام اور طریق کار پر تفصیل سے دوسری جگہ لکھ چکے ہیں جو وہاں دیکھا جا سکتا ہے

مکمل حکمت عملی ہے اور جیسا کہ ہم نے مثالیں دے کر بتایا کہ ماضی اور عہد حاضر میں یہ ایک کامیاب حکمت عملی ثابت ہوچکی ہے۔

تاہم جب تک جماعت کی قیادت اس پر یکسو نہیں ہوتی اور 'اسلامی انقلاب بذریعہ سیاسی جدوجہد' کی حکمت عملی چھوڑ کر 'اسلامی انقلاب بذریعہ اصلاح معاشرہ' کی مولانا مودودیؒ کی تجویز کردہ متبادل حکمت عملی کی طرف نہیں لوٹتی اُس وقت تک کے لیے ہم ایک درمیانی راستہ تجویز کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ جماعت اپنی سیاسی جدوجہد کے منہاج کو بے شک نہ چھوڑے لیکن تقسیم کار کا اصول اپنا لے جو زیادہ فطری اور زیادہ مؤثر ثابت ہوسکتا ہے۔ تقسیم کار کے اصول سے ہماری مراد یہ ہے کہ اس وقت جماعت اپنا کام وحدانی طریق کار اور centralized approach کے ذریعے انجام دے رہی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ کام زندگی کے مختلف شعبوں (طلبہ، اساتذہ، مزدور، کسان وغیرہ) اور مختلف دائروں (دعوت، نشر و اشاعت، تعلیم، خدمت خلق وغیرہ) میں ہو رہا ہے لیکن ان کاموں کا رُخ ایک ہے اور اُن کا آخری ہدف، حاصل اور مآل ایک ہے اور وہ سیاسی جدوجہد کے ذریعے اقتدار میں آ کر پاکستان میں شریعت کا نفاذ ہے۔ تقسیم کار سے ہماری مراد یہ ہے کہ جماعت 'تبدیلی بذریعہ سیاسی جدوجہد' پر قائم رہتے ہوئے 'تبدیلی بذریعہ اصلاح معاشرہ' کو بھی اپنا ہدف قرار دے لے اور اپنے ارکان اور کارکنوں کو اجازت دے دے کہ جو لوگ اپنے مزاج، ذوق اور صلاحیت کو اِن کاموں کے لیے زیادہ موزوں سمجھتے ہیں وہ اس ہدف کے لیے منظم ہو جائیں بلکہ جماعت خود اس حوالے سے ان کی تنظیم سازی کرے اور ان شعبوں کو منظم کرے تاکہ ارکان و کارکنان سے نتیجہ خیز کام لیا جاسکے۔

حکمت عملی کی تبدیلی اجتہادی عمل ہے

آگے بڑھنے سے پیشتر ہم جماعت کے اصحاب فکر کے سامنے یہ بات رکھنا چاہتے ہیں کہ ہم نے سطور بالا میں جن باتوں کی طرف توجہ دلائی ہے وہ اجتہادی نوعیت کی ہیں اور ان کا تعلق حکمت عملی سے ہے جو تبدیل ہوسکتی ہے اور حالات کے مطابق تبدیل کی جانی چاہیے۔ ہم جماعت کو اس کے بنیادی ہدف اور نصب العین 'اقامت دین' سے ہٹنے کی دعوت نہیں دے رہے بلکہ اس ہدف کے حصول کے لیے اختیار کی جانے والی حکمت عملی پر نظر ثانی کی دعوت دے رہے ہیں۔ حکمت عملی میں خود سید مودودیؒ نے 'اسلامی انقلاب بذریعہ سیاسی جدوجہد' اور 'اسلامی انقلاب بذریعہ اصلاح معاشرہ' کی بات کی ہے اور کام کی اپروچ موحد ہونی چاہیے یا تقسیم کار پر مبنی، یہ بھی حکمت عملی کی بات

ہے، اجتہادی بات ہے نہ کہ کوئی منزل من اللہ طریقہ جو قابل تغیر نہ ہو۔

ممکن ہے کسی ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ 'اسلامی انقلاب بذریعہ اصلاح معاشرہ' کو ہدف بنانے اور اسے تقسیم کار کے اصول پر منظم کرنے کا نتیجہ کیا نکلے گا یا اس کا فائدہ کیا ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے نتیجے میں 'سماجی تبدیلی' وجود میں آئے گی جو اسلامی بھی ہوگی اور پائیدار بھی اور اس کا سیاسی فائدہ بھی جماعت اور سیاسی تبدیلی کی خواہاں دینی قوتوں ہی کو ہوگا۔

اس امر کی وضاحت کے بعد کہ ہم نہ جماعت کو اس کا نصب العین (اقامت دین) بدلنے کو کہہ رہے ہیں اور نہ اس کے لیے اختیار کردہ حکمت عملی (تبدیلی بذریعہ سیاسی جدوجہد) چھوڑنے کو کہہ رہے ہیں بلکہ صرف یہ تجویز کر رہے ہیں کہ اس حکمت عملی میں 'تبدیلی بذریعہ سماجی جدوجہد' کی گنجائش پیدا کرلی جائے اور کام کی وحدانی اور یک طرفہ اپروچ کی بجائے تقسیم کار کا اصول اپنالیا جائے اور ہماری رائے میں یہ تجویز اقتضا ہے سید مودودیؒ کی اس تجویز کا جو انہوں نے ۱۹۴۸ء میں دی تھی کہ اگر ہم 'اسلامی انقلاب بذریعہ سیاسی جدوجہد' میں کامیاب نہ ہوسکے تو 'اسلامی انقلاب بذریعہ اصلاح معاشرہ' کی طرف پلٹ جائیں گے۔

سماجی تبدیلی کے خدوخال

اب سوال یہ ہے کہ اگر سید مودودیؒ کے متبعین 'سیاسی تبدیلی' کے ساتھ 'سماجی تبدیلی' کو بھی ہدف بنالیں تو اس کا طریق کار کیا ہوگا؟ ہم سمجھتے ہیں کہ جماعت کی فکری قیادت نے اگر اس کے بارے میں ٹھنڈے دل سے سوچا اور سنجیدگی سے اس بات پر غور کیا اور اس کے حق میں فیصلہ کیا تو وہ اس کے لیے تفصیلی لائحہ عمل خود ہی تشکیل دے لے گی کہ اس کے پاس پڑھے لکھے اور سوچنے والے افراد کی کمی نہیں۔ تاہم بطور تجویز ہم کچھ خطوط کار کی نشان دہی کیے دیتے ہیں تا کہ وہ بوقت غور وخوض سامنے رہیں۔

ہماری طالب علمانہ رائے میں 'اسلامی تبدیلی بذریعہ اصلاح معاشرہ' کے چند بڑے شعبے یہ ہوسکتے ہیں: ☆

۱۔ تعلیم و تربیت: یہ غالباً معاشرتی اصلاح کا اہم ترین شعبہ ہے جو اس وقت بُری طرح مغربیت کی زد میں ہے اور بگاڑ کا منبع ہے۔ اس کی اسلامی تناظر میں اصلاح اور نمو کی بڑی سخت ضرورت ہے۔

۲۔ میڈیا: بہت اہم شعبہ جو ذہن سازی میں انقلابی قوت کا حامل ہے۔ پاکستانی میڈیا اس وقت بگاڑ کا بنیادی ذریعہ ہے جب کہ اس میں اسلامی حوالے سے کام برائے نام ہے۔

۳۔ اصلاح اخلاق: محلہ وار کمیٹیوں کے ذریعے اصلاح اخلاق و رسوم اور نوجوانوں کا رُخ تعمیری سرگرمیوں کی طرف موڑنا۔

۴۔ معیشت: محلہ وار کمیٹیاں جو غریبوں، بیواؤں اور مساکین کی مدد کریں اور انہیں خودکشیوں سے بچائیں۔قوم کے قابل اعتماد افراد پر مشتمل زکوٰۃ کونسل کروڑوں بلکہ اربوں روپے جمع کر کے غریبوں کی مشکلات کم کرسکتی ہے۔

۵۔ عدل وانصاف: عوامی سطح پر علماء کرام کی مدد سے شرعی/مصالحتی عدالتوں کا ملک بھر میں قیام تاکہ لوگوں کو سستا انصاف ملے جو مطابق شریعت بھی ہو۔

۶۔ امن و امان: محلہ وار کمیٹیوں کی وساطت سے نوجوانوں کو متحرک کرنا جو رات کو پہرہ دے کر چوروں اور ڈاکوؤں سے بچائیں اور امن و امان قائم رکھنے میں مدد دیں۔

جیسا کہ دیکھا جاسکتا ہے کہ مندرجہ بالا چھ نکات میں سے پہلے تین کا تعلق اصلاح معاشرہ سے ہے اور آخری تین کا خدمت خلق سے۔اصلاح فرد و معاشرہ اور خدمت خلق دونوں شرعی مطلوبات ہیں اور قرآن وسنت میں ان کے تفصیلی دلائل موجود ہیں۔امید ہے سید مودودیؒ کے متبعین ٹھنڈے دل و دماغ سے مسلم معاشرے میں اسلامی شریعت پر عمل بذریعہ سماجی تبدیلی کی ہماری اس تجویز پر غور فرمائیں گے جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر حکمران ملک میں شریعت نافذ نہ بھی کریں تو عوامی اور اجتماعی قوت سے منظم ہوکر جہاں تک آئین و قانون اجازت دیتا ہے، شریعت پر عمل کی راہ نکال لی جائے۔اس طرح شریعت بڑی حد تک بغیر اقتدار کے مسلم معاشرے میں نافذ ہوجائے گی۔

استدراک: ممکن ہے جماعت کے بعض احباب کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ ان مجوزہ کاموں میں سے کئی ایک تو جماعت اب بھی کررہی ہے تو نئی بات کیا ہوئی؟ ہم عرض کرتے ہیں کہ ہماری تجویز اور جو کام اِس وقت ہورہے ہیں ان میں نوعیت کے لحاظ سے بنیادی فرق ہے۔

۔ جماعت کا مرکزی اور بنیادی ہدف اس وقت سیاسی جدوجہد کے ذریعے اقتدار میں آکر نفاذ شریعت ہے۔ باقی سارے شعبے اسی مقصد کے گرد گھوم رہے ہیں اور دیگر دائروں میں کام کی نوعیت ضمنی اور فروعی ہے۔

۔ جب اسلامی انقلاب بذریعہ اصلاح معاشرہ اور سماجی تبدیلی بھی ایک باقاعدہ ہدف ہوگا تو ان کاموں کی حیثیت اور نوعیت بھی بدل جائے گی۔

اس بات کو ایک دو عملی مثالوں سے سمجھا جاسکتا ہے مثلاً اِس وقت اصلاح معاشرہ چونکہ بنیادی ہدف نہیں ہے اس لیے الیکٹرانک میڈیا میں جماعت کا کام نہ ہونے کے برابر ہے۔ جب یہ ہدف ہوگا تو جماعت اپنا چینل بھی قائم کرے گی، دوسرے چینلز کی اصلاح کے لیے بھی کمیٹیاں بنیں گی،

سی ڈیز، DVDs کی ملک بھر میں فوری تقسیم کا بھی انتظام ہوگا، انٹرنیٹ کے اسلامی مقاصد کے لیے استعمال کے طریقے بھی سوچے جائیں گے۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔ یا تعلیم اداروں کی مثال لیجیے۔ جماعت سے متعلق لوگوں نے ہزاروں تعلیمی ادارے قائم کرر کھے ہیں لیکن بدقسمتی سے ان کی اکثریت مغربیت کے سیلاب میں بہہ چکی ہے لیکن جماعت کی اس پر زیادہ توجہ نہیں ہے۔ اب اگر جماعت اس کام کو اپنا ہدف بناتی ہے تو وہ کوشش کرے گی کہ جماعت کے لوگوں کے موجودہ تعلیمی اداروں کی بھی اصلاح ہو اور وہ مغربیت کے چنگل سے نکل کر صحیح اسلامی تناظر میں کام کرنے لگیں اور مزید ہزاروں نئے تعلیمی ادارے قائم کیے جائیں تا کہ نئی نسل کو اسلامی تعلیم و تربیت مہیا کی جاسکے و قِس علی ذلک۔

ملی مجلس شرعی

توہین رسالت کے بارے میں تمام مکاتب فکر کا متفقہ فتویٰ

۱۔ کیا فرماتے ہیں مفتیان دین وشرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ سابقہ گورنر پنجاب سلیمان تاثیر جوخود کو مسلمان کہلواتا تھا اس نے قانون تحفظ ناموس رسالت کو انسانوں کا بنایا ہوا قانون قرار دیا اور اس کا استہزا کرتے ہوئے اسے کالا قانون بھی قرار دیا: (روزنامہ نوائے وقت 23 نومبر 2010ء صفحہ ۱)

پھر اس قانون کے تحت مجاز عدالت سے سزا پانے والی ایک مجرمہ آسیہ مسیح کی سزا کے بارے میں یہ کلمات کہے کہ اسے دی جانے والی سزائے موت ایک سخت اور بڑی ظالمانہ سزا ہے اور قائداعظم محمد علی جناح کے پاکستان میں ایسا قانون نہیں تھا اور نہ اس قسم کی ظالمانہ سزا ہوسکتی تھی۔

Asia Bibi Press Conference;http://www.salmaantaseer.com/main.aspx

اس سے قبل اس نے واضح طور پر یہ اعلان کیا تھا کہ ملک مولویوں نے ٹھیکہ پر نہیں لیا ہوا، جو ہر بات پر شور مچاتے ہیں۔ 1973 کے آئین پر قوم متفق ہے اور یہی آئین جمہوریت کی بقا ہے۔ ناموس رسالت کے قانون کو جلد ختم کر دیا جائے گا اور میں اپنے اس مؤقف پر قائم ہوں۔

(روزنامہ جناح، ہفتہ 19 ستمبر 2009ء)

اس نے اپنے اس مؤقف کا اعادہ اس وقت بھی کیا جب ایک نجی ٹی وی سماء کی ایک اینکر نے اس سے گفتگو کرتے ہوئے سوال کیا کہ Blasphemy Law یعنی قانون توہین رسالت بھی تو

پارلیمنٹ نے منظور کیا تھا۔ اس نے جواباً یہ کہا کہ ہاں تو اب نئی اسمبلی آئی ہے 18 ویں ترمیم بھی اسمبلی نے پاس کی ہے جو قانون پہلے سمجھتے تھے ٹھیک نہیں ہے ان میں ترمیم لانے میں کون سا برا کام ہے اس پر بیٹھ کر نظر ثانی کریں۔ (دیکھیں: Youtube: Salman Taseer on Blasphemy Law)

لہٰذا اس قانون کو کالا قانون قرار دینا اور اس کے خاتمے کے در پے ہو جانا اور اعلانیہ و بتکرار اس قانون کے خلاف ہرزہ سرائی کرنا اور تنقیص و تخفیف کرنا کیا از روئے شرع توہین رسالت کے زمرے میں نہیں آتا؟ جبکہ اس طرز عمل کا صرف ایک ہی مقصد نظر آتا ہے کہ اہانت رسول کے مجرموں کو اس جرم کے ارتکاب پر شہ دی جائے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ناموس کے معاملے کو ایک کھیل تماشہ بنا دیا جائے۔

اسی طرح سلمان تاثیر کا توہین رسالت کی ایک ایسی مجرمہ کے ساتھ اظہار ہمدردی کرنا جسے مذکورہ قانون کے تحت ملک کی مجاز عدالت طویل ٹرائل کے بعد سزائے موت کا حکم دے چکی ہو جبکہ ٹرائل سے قبل ایف آئی آر کے اندراج کے وقت اس معاملہ کی چھان بین اور تفتیش قواعد کے مطابق ضلعی سطح کے ایک پولیس آفیسر نے کی ہو۔ جس کے روبرو اس مجرمہ نے اعتراف جرم بھی کیا ہو اور اس کے ہم مذہب مذہبی رہنماؤں نے بھی اسے مجرمہ قرار دیا ہو۔ ایسی مجرمہ کے ساتھ ہمدردی کے لیے اس کا اپنے خاندان کے لوگوں کے ساتھ اسے جیل میں جا کر ملنا، اسے سزا سے بچانے کی یقین دہانی کرانا، میڈیا کے لوگوں کو یہ کہہ کر مدعو کرنا کہ آج میں بہت بڑا دھما کا کرنے جا رہا ہوں اور پھر اس خاتون کو ساتھ بٹھا کر جیل ہی میں پریس کانفرنس کرنا اور قانون تحفظ ناموس رسالت کو کالا قانون قرار دینا کیا اس کے گستاخ رسول ہونے پر کاملاً دلالت نہیں کرتا اور کیا ایسا شخص از روئے شرع مباح الدم نہیں ہو جاتا؟

اس کی طرف سے قانون تحفظ ناموس رسالت کے تحت ملنے والی سزائے موت کو ظالمانہ اور سخت سزا قرار دینا اور اس قانون کو ختم کروانے کا اعلان کرنا از روئے شرع کیسا فعل ہے؟ جبکہ یہ قانون کتاب وسنت کی صریح نصوص پر مبنی ہے اور وفاقی شرعی عدالت اسے کتاب وسنت کے عین مطابق قرار دیکر اسے بطور حد نافذ کرنے کا فیصلہ دے چکی ہے اور اسی فیصلہ کی رو سے یہ قانون ملک کا رائج اور نافذ العمل قانون ہے اور اس کے تحت ملنے والی سزا کو کتاب وسنت کی موافقت میں اسی قانون کی

رو سے حد کا درجہ بھی دیا گیا ہے اس کی طرف سے حدود الٰہی کو ظالمانہ سزا قرار دینا کیا کتاب وسنت اور حدود الٰہی کے انکار کے مترادف نہیں ہے اور کیا از روئے شرع اس کے صریح کفر پر دلالت نہیں کرتا؟ اور ایسے کفر صریح کے مرتکب کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟

کیا اس کے درج ذیل اقوال وافعال بھی اسی امر پر دلالت نہیں کرتے کہ وہ صریح کفر کا مرتکب ہوا ہے؟ وہ احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے والی آئینی شق کے خلاف تھا۔ اس کی بیٹی شہر بانو تاثیر نے انڈیا کے ایک نجی ٹی وی N.D TV چینل کے پروگرام THE BUCK STOPS HERE میں انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ میرے والد احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے والی آئینی شق کے خلاف تھے۔ (دیکھیں: 11 Jan 2011 Jang News)

جس کا واضح مفہوم یہ ہے کہ وہ احمدیوں کو کافر نہیں سمجھتا تھا بلکہ ان کو کافر اور اقلیت قرار دینے والی آئینی دفعہ کو بھی ختم کروانا چاہتا تھا اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ عقیدۂ ختم نبوت کو بھی نہیں مانتا تھا ۔اسی طرح اس کے بیٹے آتش تاثیر نے اپنی کتاب میں اس کی نجی زندگی کے بعض اہم پہلوؤں کو بے نقاب کرتے ہوئے لکھا ہے:

''میرا باپ جو ہر رات شراب (سکاچ) پیا کرتا تھا اس نے کبھی بھی نہ تو روزہ رکھا اور نہ ہی نماز ادا کی حتی کہ وہ خنزیر کھاتا تھا اور ایک دفعہ اس نے بتایا کہ صرف ایک ہی مرتبہ ایسا ہوا وہ بھی جب میں جیل میں تھا اور مجھے پڑھنے کے لیے صرف قرآن ہی دیا گیا تو میں نے اسے پیچھے سے لیکر آگے تک کئی بار پڑھا اور میں نے یہی محسوس کیا کہ اس میں میرے لیے کچھ بھی نہیں تھا''

(دیکھیں: Stranger to History by Aatish Taseer Page No:21-22)

جبکہ اس کے یہ جملے صرف اللہ کی کتاب کی صریح تنقیص واستخفاف ہی کو ظاہر نہیں کرتے بلکہ ان سے اللہ کی کتاب کا انکار بھی لازم آتا ہے۔

۲۔ ممتاز حسین قادری نے اس کو از خود اقدام کرتے ہوئے اس لیے قتل کر دیا کہ وہ گستاخ رسول اور مباح الدم تھا۔ ممتاز حسین قادری کے پیش نظر اس کے گستاخ رسول اور مباح الدم ہونے پر علمائے کرام کے فتوے بھی تھے اور وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ یہ ایک بااثر شخص ہے اور پنجاب کا آئینی سربراہ ہونے کے ناطے اسے آئین پاکستان کی رو سے یہ استثنیٰ حاصل ہے کہ اس عہدے کی مدت کے

دوران اس کے خلاف کوئی فوجداری یا سول مقدمہ درج نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ ممتاز حسین قادری نے اپنی غیرت ایمانی کا تقاضہ سمجھتے ہوئے اسے قتل کردیا۔

ممتاز حسین قادری کا اس طرح قانون کو ہاتھ میں لے کر ایک شاتم رسول ملحد اور زندیق کو جہنم واصل کرنا از روئے شرع کیسا فعل ہے؟ کیا ممتاز حسین قادری کو اسلام کے قانون قصاص و دیت کے تحت کوئی سزا دی جاسکتی ہے یا تعزیری طور پر بھی وہ از روئے شرع کسی سزا کا مستوجب ہے؟ بینوا وتوجروا

سائل : محمد محبوب الرسول قادری
اسلامک میڈیا۔۔۔۔دربار مارکیٹ لاہور
0300/0321-9429027
E-mail: mahboobqadri787@gmail.com

جواب

منہ الصدق والصواب

1۔ جو واقعات اور شواہد سائل نے سلمان تاثیر کے حوالے سے ہمارے سامنے رکھے ہیں۔ ان سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ سابقہ گورنر پنجاب سلمان تاثیر نے تحفظ ناموس رسالت کے ضامن قانون کو جو کہ وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کی رو سے ملک میں حداً نافذ ہے۔ کالا قانون کہہ کر اور اس قانون کے تحت مجاز عدالت سے سزا یافتہ مجرمہ کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کر کے اور اس کی سزا کو ظالمانہ اور سخت سزا کہہ کر پھر اس قانون کو ختم کرانے کے عزم کا اظہار کر کے اور اس سابہ مشرکہ کی سزا کو ہر حال میں معاف کرانے کا اعلان کر کے توہین و تنقیص رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارتکاب کیا۔ جس کی بنا پر وہ مباح الدم ہوگیا تھا۔ اگرچہ ایسے بد بخت کے ساتھ نمٹنے کیلئے ملک میں قانون موجود ہے اور اصولاً اس کے خلاف اسی قانون کے تحت کارروائی کی جانی چاہیے تھی لیکن کیونکہ اسے آئین پاکستان کی رو سے استثنیٰ حاصل تھا اور اس کے خلاف فوج داری مقدمہ قائم نہیں ہوسکتا تھا۔ بعض حضرات نے اتمام

حجت کے لیے تھانہ سول لائینز میں مقدمہ درج کرانے کی کوشش بھی کی لیکن مذکورہ دستوری استثنیٰ ان کی راہ میں حائل ہو گیا۔

اندریں صورت حکومت کی ذمہ داری تھی کہ وہ اسے اس کے منصب سے الگ کر دیتی تا کہ اس کے خلاف حسب قانون کارروائی کی جاسکتی لیکن حکومت اس مسئلے پر خاموش تماشائی بنی رہی۔ جس کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے سلمان تاثیر اپنے باطل مؤقف پر ڈٹا رہا اور شرعی فتووں کا استخفاف بھی کرتا رہا جو کہ فی نفسہ وجوہ کفر میں سے ہے۔ اس نے ملک میں رائج شرعی قانون کے تحت مجاز عدالت کی طرف سے سزا یافتہ مجرمہ کو بے گناہ قرار دے کر اور اس کا معاملہ قانونی حدود کے اندر رہتے ہوئے بالائی عدالتوں میں لے جانے کا راستہ ترک کر کے پوری قوم کو قانون شکنی کا پیغام دیا۔ کتاب وسنت کی تصریحات کی روشنی میں گستاخی رسالتمآب کا مرتکب واجب القتل ہے۔ پوری امت اس کے وجوب قتل پر متفق ہے۔

2۔ اس کے علاوہ اس کا شرعی حد کو ظالمانہ کہنا اور اس کا استہزاء کرنا شرعاً استخفاف شریعت ہے جس سے کفر لازم آتا ہے۔ سائل ہی کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق اس کا اپنی بیٹی کی گواہی کی رو سے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے والی آئینی شق کے مخالف ہونا اور اس آئینی شق کو ختم کرانے کا عزم رکھنا اس کے کفر صریح کی دلیل ہے کیونکہ عقیدۂ ختم نبوت کتاب وسنت کی نصوص اور فقہاء کرام کی تصریحات کے مطابق ضروریات دین میں سے ہے۔ جس کے انکار سے منکر پر صریح کفر لازم آتا ہے اسی طرح اس کا قادیانیوں اور آسیہ مسیح کے کفر وشتم پر راضی ہونا رضا بالکفر ہے۔

کتاب وسنت کی نصوص اور فقہاء کی تصریحات کے مطابق رضا بالکفر کا مرتکب خود بھی کافر ہو جاتا ہے لہذا ان وجوہ کفر کی بنا پر بھی وہ مرتد اور مباح الدم ہو چکا تھا۔ اس سے توبہ کا مطالبہ بھی کیا گیا لیکن وہ اپنے کفر وارتداد پر ڈٹا رہا۔

3۔ غازی ممتاز حسین قادری جو کہ اس کی حفاظت پر مامور تھے انہوں نے مذکورہ بالا حالات میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت سے مغلوب ہو کر اسے قتل کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واضح ارشادات کے مطابق ایسے شاتم کا خون باطل اور رائیگاں ہے اگر کوئی مسلمان اسے قاضی یا امام سے سبقت لے کر بھی قتل کر دیتا ہے تو اس پر کوئی قصاص یا دیت نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس

معاملے کو خصوصی اہمیت دی ہے اور اسے ایک استثنائی معاملہ قرار دیا ہے۔ائمہ اربعہ کے نزدیک بھی مرتد کو ماروائے عدالت قتل کرنے والے مسلمان پر کوئی قصاص یا دیت نہیں ہے۔

لہٰذا دہشت گردی کی عدالت کی طرف سے غازی ممتاز حسین قادری کو ملنے والی سزائے موت کتاب وسنت کی رو سے سراسر غلط ہے کیونکہ اس سزا کے نافذ ہونے کی صورت میں مرتد کے عوض مسلمان کا قتل لازم آئے گا۔جس کی شریعت اسلامیہ ہرگز اجازت نہیں دیتی ۔ غازی ممتاز حسین قادری کے بارے میں دہشت گردی کی عدالت کے جج کے فیصلے سے بھی ہمارے اس مؤقف کی تائید ہوتی ہے جس میں اس نے تسلیم کیا ہے کہ غازی ممتاز حسین قادری نے جو کیا وہ اسلامی لحاظ سے درست ہے یعنی سلمان تاثیر نے توہین رسالت ہی کی تھی اور اس کی سزا بھی یہی ہے تاہم اس نے انہیں دوسرے ملکی قوانین کے تحت سزا دی ہے آپ کے تمام سوالات کا مختصر جواب یہی ہے ۔ البتہ ہم نے اس مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر مدلل اور مفصل جواب بھی لکھ دیا ہے۔

البرہان پر قارئین کے تبصرے

شمارہ اکتوبر ۲۰۱۱ء (جاوید غامدی صاحب کا تجدد اور مولانا زاہدالراشدی صاحب کی اس کی حمایت)

خلاف توقع اس شمارے کی پذیرائی ہوئی۔ بہت سے لوگوں نے بذریعہ خط اور فون تعریف کی اور بعض نے مزید شمارے منگوائے۔ چند مختصر اور اہم ردعمل درج ذیل ہیں:

عطاء الحق قاسمی: آپ کی نثر عمدہ ہے اور آپ نے بات سلیقے اور متانت سے کی ہے ــــ اگرچہ آپ کی بعض آراء سے مجھے مکمل اتفاق نہیں ہے۔

مولانا حافظ عبدالرحمن مدنی: آپ نے جھجکتے اور ڈرتے ہوئے غامدی صاحب پر قلم اٹھایا ہے

حالانکہ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کا مؤقف صحیح ہے اور غامدی صاحب کا مؤقف گمراہی پر مبنی ہے تو آپ کو کھل کر اور جرأت سے اپنے مؤقف کا اظہار کرنا چاہیے تھا۔آپ کے کمزور اسلوب کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مولانا زاہد الراشدی صاحب نے جارحانہ رویہ اختیار کر کے آپ کو خوب رگیدا ہے۔اب آپ کو اپنا دفاع مضبوطی سے کرنا چاہیے۔

بشیر احمد عارف (منصورہ): کافی عرصے بعد آپ کے قلم سے کوئی جاندار تحریر دیکھنے کو ملی۔

مولانا ارشاد الحق اثری (فیصل آباد): آپ نے گمراہی کے اس ماخذ کا ذکر کر کے بہت سے لوگوں پر حقیقت کھول دی ہے۔

سید خالد جامعی (کراچی یونیورسٹی): آپ نے نہ صرف جاوید احمد غامدی صاحب کی نقاب کشائی کی ہے بلکہ مولانا زاہد الراشدی صاحب کا پول بھی کھول دیا ہے جو انہیں مجتہد سمجھتے ہیں اور جنہوں نے اپنا بیٹا اور اپنا پرچہ اس کی پر زور حمایت کے لیے وقف کیا ہوا ہے لیکن خود ملفوف انداز میں اس کی حمایت کر کے دیو بندی حلقے کو فریب دے رہے ہیں۔

مولانا زاہد اقبال (اسلام آباد): آپ نے بیماری کو جڑ سے پکڑا ہے اور فروعی مسائل میں الجھنے کی بجائے مغربی تہذیب سے مرعوبیت کے اصل سبب کی نشان دہی کر دی ہے۔

ڈاکٹر محمد ایوب (اٹک): آپ نے جس انداز میں جاوید غامدی صاحب کی گمراہی کی قلعی کھولی ہے وہ بہت مؤثر ہے۔امید ہے آپ کی تحریر سے بہت سے لوگ گمراہ ہونے سے بچ جائیں گے۔

عبدالرؤف شاہزادہ (ڈیفنس، لاہور): میں نے اس شمارے کی کاپیاں اپنے ان دوستوں کو بھجوائی ہیں جو غامدی صاحب کے وائرس سے متاثر ہو چکے ہیں۔

تنویر احمد بٹ (کراچی)

اس بار آپ نے خلاف معمول ایک نہایت حساس، اہم اور فوری توجہ کے حامل مسئلہ پر نہایت پُر مغز مقالہ نذرِ قارئین کیا ہے جس پر آپ بلا شبہ تحسین کے مستحق ہیں۔

کافی عرصہ پہلے میں نے مدیر 'ساحل' سے گفتگو کے دوران ان کی توجہ ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ کی بدلتی ہوئی پالیسیوں کی جانب مبذول کرائی تھی۔ دراصل آج تجدد پسند نام نہاد دینی افراد نہ صرف

شد و مد کے ساتھ حدیث کو ہدف تنقید بنا رہے ہیں بلکہ اس ضمن میں نت نئے اعتراضات بھی وارد فرمارہے ہیں۔ اسی طرح آج یہ طبقہ بیرونی امداد کے سہارے دین میں اجتہاد کا مطالبہ بھی کررہا ہے تاکہ صدیوں سے ان متفق علیہ امور میں مداخلت کرکے ہمارے عقائد کو تہس نہس کردے اور یہی ان کے آقایان ولی نعمت کی خواہش و منشا ہے۔

دیکھیں آج جو صلیبی جنگ جاری ہے یہ صرف ہمیں خاک و خون میں ملانے یا ہمارے وسائل لوٹنے ہی کے لیے برپا نہیں ہے بلکہ دراصل ہنود و یہود اور نصاریٰ کی یہ منحوس تثلیت ہمیں ہمارے عقائد ہی سے منحرف کرنے پر کمر بستہ ہے اور اس گھناؤنے کھیل میں محض ان کی ریشہ دوانیاں، چالیں اور سازشیں ہی نہیں بلکہ ہماری اپنی صفوں میں شامل میر جعفر و میر صادق ان کے اعوان و انصار اور مدد گار بنے ہوئے ہیں۔ وہ حضرت اکبر الہ آبادیؒ نے کیا خوب فرمایا تھا کہ ؎

مٹاتے ہیں جو وہ ہم کو تو اپنا کام کرتے ہیں
مجھے حیرت تو ان پر ہے جو اس مٹنے پہ مرتے ہیں

البتہ جس علمی انداز میں دلائل اور سنجیدگی کے ساتھ آپ نے غامدیت کی سرجری فرمائی ہے اور اسی طرح سچے علماء کے گھرانے میں عمار ناصر صاحب کی صورت میں وارد ہونے والے کی جس طرح آپ نے متین و سلجھے ہوئے انداز میں تنقید فرمائی ہے وہ قابل تحسین ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائیں۔ آمین یا ارحم الراحمین۔

ایسے ہی متجددین حضرات میں ایک نام ڈاکٹر شبیر احمد (ایم ڈی) مقیم فلوریڈا بھی ہیں جو احادیث کے بارے میں جگت بازی کرتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت نصیب فرمائے (آمین)۔ افسوس صد افسوس کہ مال و زر کے لالچ، ٹیلی وژن کے پروگراموں اور پی سی بھوربن میں منعقدہ جلسوں نے ہمارے بہت سے لوگوں کو دارارقم سے اٹھا کر ابوجہل کے کیمپ میں پہنچا دیا ہے۔ اور آج یہ حضرات حبّ جاہ، حبّ دنیا اور ہوا پرستی کے باعث مغرب کے برپا کردہ سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہہ رہے ہیں لیکن دوسری طرف ہمارے محبوب آقا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے فرمان کے مطابق وہ افراد ہیں جو دین پر عمل پیرا ہیں اور ہاتھوں میں انگارے اٹھا رہے ہیں۔ اللہ پاک ان کی غیب سے مدد فرمائیں (آمین)۔

ماہِ رواں کے ماہنامہ محدث لاہور میں بھی مفتی عبدالواحد صاحب حفظ اللہ کا شاتم رسول کی سزا اور

عمار ناصر کے مؤقف پر ایک عمدہ مضمون شائع ہوا ہے پھر اسی شمارے میں جامعہ ابو ہریرہ کے مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب کا مکتوب بھی الشریعہ اور مسٹر عمار کی مذمت میں شائع ہوا ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ آپ کے مضمون اور مذکورہ مختصر مضامین کے علاوہ اس طرح کے افراد، اداروں اور تنظیموں کے شائع شدہ لوازمے کومختصر کتابچوں کی صورت میں مربوط طریقہ سے شائع کیا جائے۔آج ٹیلی وژن زدہ معاشرے میں بیشتر لوگ ان گمراہ افراد، اداروں اورتحریکوں کے بارے میں واقفیت ہی نہیں رکھتے اور محض ٹیلی وژن پر ان بظاہر نرم خو اور ضبط وتحمل کے حامل اداکاروں کے لچھے دار اور اپنے مخصوص انداز میں کہے ہوئے جملوں اور فقروں کے سحر میں کھوجاتے ہیں اور ان کی بازیگری کا شکار ہوجاتے ہیں۔''عالم آن لائن'' اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔

معاملہ کچھ یوں لگتا ہے کہ ہم نے اچھائی بُرائی، اسلام اور کفر، صحیح وغلط، خوشی اورغمی اورمعروف و منکر کے اصول وضوابط بجائے قرآن و حدیث سے اخذ کرنے کے خود ہی گھڑ لیے ہیں اور پھر اپنی ناقص عقلوں کے تحت ان پر مُصر بھی ہیں اسی لیے اگر ہمیں کوئی درست راہ دکھائے یا پھر قرآن وسنت کی بابت اصرار کرے تو ایسے افراد کو بنیاد پرست، دہشت گرد، ناقص الذہن اورحتیٰ کہ طالبان کہنے سے بھی نہیں چوکتے۔خواہ وہ درست اور ہم غلط ہی کیوں نہ ہوں! آج ہم نے قرآن وحدیث کو پسِ پشت ڈال رکھا ہے اور جو کچھ ہمارے پاس ہے ہم اس پر شاداں وفرحاں ہیں! اللہ پاک ہماری حفاظت فرمائیں ہمیں ابلیسی مغالطوں اور شیطانی فتنوں سے محفوظ رکھیں اور دین کی صحیح فہم عنایت فرمائیں (آمین)۔ ہمارا تو حال بقول حضرت اکبرالہ آبادیؒ کچھ یوں ہے کہ ؎

حج بھی کعبہ کا کیا اور گنگا کا اشنان بھی
خوش رہے رحمن بھی راضی رہے شیطان بھی

پروفیسر ارشد جاوید (ماہرنفسیات، لاہور)

جمہوریت اور اسلامی انقلاب: مجھے آپ کی اس رائے سے اتفاق نہیں کہ جمہوریت کے ذریعے اسلامی انقلاب نہیں آسکتا۔آسکتا ہے لیکن عملاً اس لیے نہیں آیا کہ لانے کے دعویداروں میں نہ اس کی صلاحیت ہے اور نہ صالحیت۔یعنی نہ ان میں اخلاص اور جذبہ ہے اور نہ اتنی اہلیت وصلاحیت کہ وہ اسلامی انقلاب لاسکیں۔ اگر ان میں اخلاص ہوتا تو ذاتی اور جماعتی مفادات سے بالاتر ہوکر اسلام کے لیے سوچتے اور صلاحیت ہوتی تو کارکردگی دکھاتے لیکن دینی جماعتوں کے اتحاد ایم ایم اے کو

صوبہ سرحد میں پانچ سال حکومت کرنے کا موقع ملا اور کارکردگی صفر رہی تو اسلامی انقلاب کیسے آئے؟

مجوزہ قرآن یونیورسٹی: مجھے آپ کے تعلیمی نظریات سے عمومی اتفاق ہے خصوصاً اس بات سے کہ آپ تربیت اور کردار سازی پر زور دیتے ہیں لیکن البرہان کے تازہ شمارے میں آپ کی اس بات سے مجھے اتفاق نہیں ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم کا قرآن کالج اس لیے ناکام ہوگیا کہ اس کا نام 'قرآن کالج' تھا۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ وہ اس لیے ناکام ہوا کہ اس کا معیار تعلیم ناقص تھا۔ اگر اس میں لائق اساتذہ ہوتے اور اس کا نظام تعلیم فعال اور مؤثر ہوتا تو وہ یقینا کامیاب ہوسکتا تھا۔

تنویر احمد بٹ (کراچی)

نظریاتی تحریکیں اور نان ایشوز: پچھلے ماہ کے البرہان میں 'نان ایشوز' کے عنوان سے آپ کا مختصر شذرہ پڑھا اور یک لخت زبان سے انا للہ و انا الیہ راجعون نکلا۔ بلاشبہ آج لارڈ میکالے کی تعلیم کے سبب ہمارے لیے حرمت رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، دینی حمیت اور اقامت دین وغیرہ جیسے اہم اور بنیادی معاملات ثانوی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ ان کی پرکاہ کے برابر بھی اہمیت نہیں جبکہ 'نان' ہمارے لیے بنیادی اہمیت اور زندگی وموت کا مسئلہ ہے۔ آج ہم جس طرح یہود ونصاریٰ اور ہنود کی پیروی میں گوہ کے بلوں میں گھسے جارہے ہیں تو یہ دین سے دوری اور مادیت پرستی ہی کا نتیجہ ہے۔

ان سوالات کو آپ نے سن کر ہضم فرمالیا ضرورت تو اس امر کی تھی کہ آپ خود بھی ان سوالات کے مسکت جوابات دیتے لیکن چلیں غنیمت ہے کہ آپ نے کم از کم یہ سوالات اہل علم کے سامنے تو رکھے۔ اللہ کرے کوئی عالم ان کے بھرپور جواب عطا کرے (آمین)۔ ہم تو مسلمانوں کی موجودہ روش کو دیکھ کر کہ کس طرح وہ اس دین کے بارے میں مسلمان ہوتے ہوئے بھی استہزائیہ انداز اور بے باکانہ جرأت بلکہ بسا اوقات دریدہ دہنی تک اتر آتے ہیں، یہی کہہ سکتے ہیں کہ ؂

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

دین پر عمل سے تو ہم کافی حد تک پہلے ہی فارغ ہو چکے ہیں لیکن یہ جو دین سے ایک زبانی اور جذباتی لگاؤ باقی رہ گیا ہے ہمارے مغرب سے پڑھے لکھے مہذب، روشن خیال اور جدت پسند نیم دانشور اس واجبی تعلق کو بھی جلد از جلد قصۂ پارینہ بنا دینا چاہتے ہیں۔ اسی لیے تو کبھی آغا خان